احکامِ مدارس

مؤلف :

مفتی عبیدالرحمن صاحب، مردان

رئیس دارالافتاء والارشاد، مردان

مکتبہ دارالتقوی، مردان

فہرست مضامین

رائے گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا انور الحق صاحب

مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

مرکزی نائب صدر وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

الحمد لله وکفیٰ والصلاة والسلام علیٰ خیر الخلائق والانبیاء محمد المصطفیٰ المجتبیٰ وعلیٰ آله وأصحابه الاتقیاءالیٰ یوم الجزاء.هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ .

اس آیت کی پیش نظر آپ ﷺ کی بعثت کے چار اہم مقاصد ہیں:(۱) آیات تلاوت (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت۔

ان چاروں کی ذمہ داری آپ ﷺ نے بحسن خوبی واحسن اکمل طریقہ سے تکمیل تک پہنچایا بلکہ آپ ﷺ نے پورا حق ادا فرمایا۔

آپ ﷺ نے اپنے مابعد علماء کرام کو اپنا وارث قرار دیااور فرمایا:" العلماء ورثۃ الانبیاء"اسی لئے آپ کے رحلت کے بعد اس امت کے علماء کرام کی بھی یہی چار بڑی ذمہ داریاں بنتی ہیں جن کو زندگی کا مقصد اور نصب العین بناکر ہمہ تن ان میں مصروف رہنا وراثت نبوت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

اسی سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس کے لئے مناسب ماحول مہیا کرنے اور طلباء علوم نبوت کیلئے طلب علم کی صعوبتوں کو حتی الوسع آسان بنانے کے لئے ان اہل علم نے مدارس کی بنیاد رکھی۔ یہ بات واضح ہے کہ امت مسلمہ کے حق میں یہ مدارس اللہ تعالی کی بڑی نعمت ہے جس میں علماء کرام پورے امت کو نور نبوت سے منور کرتے ہیں۔ لیکن

اس میں بھی شک نہیں کہ دینی مدارس کے بے شمار مسائل ہیں جن میں احکام شرعیہ سے آگاہی اور پورے احتیاط سے ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

عرصہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ دینی مدارس کے احکام کے متعلق ایک جامع اور مستند کتاب ہو جس میں مدارس کے مسائل کا فقہی حل موجود ہو تاکہ مدارس دینیہ کے منتظمین و مہتممین حضرات ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن مدظلہ نے اس ضرورت کا احساس کرکے "احکام مدارس" کے نام سے کتاب تحریر فرمائی ۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کتاب کو مدارس دینیہ کے کوتاہی کا ازالہ کا ذریعہ اور مصنف کے لئے ذخیرہ آخرت بنادیں۔ آمین

محمد انوار الحق عفی عنہ

مرکزی سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۵ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ بمطابق ۱۱ نومبر ۲۰۲۱

رائے گرامی حضرت مولانا مفتی عبد القدوس ترمذی صاحب زید مجدہم

مہتمم جامعہ حقانیہ، ساہیوال سرگودھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ :احقر نے رسالہ " احکامِ مدارس" مؤلفہ مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب زید مجدہم جستہ جستہ مقامات سے ملاحظہ کیا، اور اپنے موضوع پر اسے علماء طلباء کے لئے مفید پایا، مؤلفِ رسالہ جناب مولانا عبید الرحمٰن مدظلہ نے بڑی محنت اور جدوجہد سے مدارس کے متعلق بڑے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اس تالیف میں ان کی محنت اور سعی بلیغ لائق داد ہے۔

اہل مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان موضوعات پر شرعی راہنمائی کے لئے اس رسالہ سے استفادہ کریں، اور بوقت ضرورت حضرات علماء کرام وفقہاء عظام سے رجوع کرکے متعلقہ مسائل پر عمل فرمائیں۔

مؤلف نے مدارس کی ضرورت کے مسائل کو بڑی اہمیت سے بیان کیا ہے، امید ہے کہ اہل مکاتب وارباب مدارس اس رسالہ کی قدر کریں گے۔ اللہ تعالی جناب مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اوران کی اس کتاب کو قبولیت عام عطا فرمائے، اورارباب مدارس کے لئے نافع اور مفید بنائیں، آمین، فقط۔

احقر عبد القدوس ترمذی غفرلہ

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

۲/ نومبر ۲۰۲۱ء

رائے گرامی حضرت مولانا مفتی گل جمال صاحب زید مجدہم

رئیس دار الافتاء جامعہ عربیہ شیر گڑھ، مردان

الحمد للہ الذی جعل العلماء فی الارض کنجوم فی السماء وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ ختم الانبیاء والمرسلین، اما بعد:

جناب مفتی عبید الرحمن صاحب نے مدارس کے احکام کے بارے میں بہترین کتاب لکھی ہے، اللہ تعالی اس کی تصانیف میں مزید توفیق عطا فرمائیں، تمام مہتممین، مدرسین اور منتظمین کو اس کتاب پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ یقینا مفتی عبید الرحمن صاحب نے مہتممین حضرات کو متوجہ کرنے کے لئے ایک قسم شفقت کا معاملہ فرمایا ہے۔ تاکہ وہ اپنے اعمال کی اصلاح کے لئے اس کتاب کو دیکھیں تاکہ قیامت میں مجرمین کی صف میں شامل نہ ہو جائے

اور اللہ تعالی ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں اور مفتی صاحب کو مزید توفیق عطاء فرمائیں، ہمارے اور ان کے والدین اور اساتذہ کے لئے اس کتاب کو صدقہ جاریہ فرمائیں۔

تقریظ:(حضرت مولانا مفتی) محمد فاروق صاحب (زید مجدہم)

دین کی ترویج واشاعت کیلئے دینی مدارس قائم کرنااور ان کے انتظام وانصرام کو سنبھالنااور پڑھنا پڑھانا بہت ہی بڑی قربانی و دین کی خدمت اور باعث ثواب ہے اور بہت بڑی سعادت ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ نہایت اہم ،نازک اور پر خطر ذمہ داریاں بھی ہیں ،ہمارے اس پر خطر دور میں دینی مسائل کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے دینی مدارس کے انتظام وانصرام میں بہت ساری غفلتیں برتی جارہی ہیں جن کی وجہ سے ان دینی مدارس سے وہ فوائد و ثمرات حاصل نہیں ہوپارہے کو ہمارا اکابرین کے دور میں نمایاں تھے۔

انہی خرابیوں و کوتاہیوں سے بچنے کے لئے اور دینی مدارس سے خاطر خواہ فوائد و ثمرات حاصل کرنے کے لئے برادر محترم مفتی عبید الرحمان نے انتہائی اختصار کے ساتھ مگر جامع انداز میں یہ کتاب تصنیف فرماکر ان تمام کی طرف توجہ دلائی ہے جو کہ یقیناً اہل مدارس کے لئے بہترین تحفہ ہے۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی اس انتھک محنت وکاوش کو قبول فرمائے اور ان کے علم و عمل میں برکت عطاء فرمائے۔

محمد فاروق

خادم دار الافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ

سوہان اسلام آباد

تقریظ: حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمن صاحب

دار الافتاء جامعہ حمادیہ، پشاور

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام علي سيد الأنبياء والمرسلين وعلي آله وصحبه أجمعين امابعد:

مدارس چلانا بڑے اجر وثواب کا کام ہے لیکن یہ انتہائی نازک اور باریک میدان ہے کیونکہ مدارس اللہ تعالی کی نعمت ہے اس لئے ان میں تمام باتوں کی رعایت انتہائی مشکل کام ہے۔ خصوصا مدارس میں مالی انتظامات کو صحیح مصرف میں استعمال کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ نہ صرف تعلیمی معیار میں بہتری لاتا ہے بلکہ اس سے معاشرتی اور مذہبی اہمیت بھی وابستہ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مال کے صحیح استعال کی تاکید کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ (الاسراء٢٧) یعنی جو لوگ مال ضائع کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

اس آیت کے تناظر میں مدارس میں مالی انتظامات کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا ضروری ہے تاکہ مدارس کو جو مال ملتا ہے، وہ ضائع نہ ہو، اگر مدارس میں مالی انتظامات کو بلا توقع ضائع کیا جائے تو یہ نہ صرف مدارس کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ اس سے طلباء کی تعلیم پر بھی اثر پڑتا ہے، اس کے علاوہ معاشرتی اور مذہبی زاویہ سے بھی یہ غیر معقول ہے۔

مدارس میں مالی انتظام اوراوقاف کے تمام مسائل کی رعایت رکھنا بے حد ضروری ہے، جس مدرسہ کا مالی انتظام صحیح نہ ہو وہاں کے طالب علموں کو فائدہ نہیں ہوتا اس لئے کہ علم نور الٰہی ہے اور مالی بے احتیاطی کی وجہ سے نور الٰہی نصیب نہیں ہو گا، اس سلسلہ میں مولانا عبید الرحمن صاحب نے ایک نہایت مفید کتاب لکھی ہے جو کہ مہتمین، منتظمین

مدارس بلکہ ہر عالم کی ضرورت ہے، قلم میں روانگی اور شستگی کی وجہ سے ہر قاری کا دل چاہتاہے کہ یہ کتاب اول تا آخر پڑھے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کے علم اور تصنیف و تالیف میں میں مزید ترقی نصیب فرمائے اور ان کی کاوش کو اپنے دربار عالی میں قبول فرماکرلوگوں کواس کے ذریعے سے نفع نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین

بندہ مطیع الرحمن عفی عنہ

دارالافتاء جامعہ حمادیہ دلہ زاک روڈ کبوتر چوک پشاور

ابتدائیہ: از حضرت مولانا مفتی ضیاء الدین صاحب

مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب ہمارے بڑے محبوب قابلِ احترام دوستوں میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تصنیف و تالیف کا خصوصی ذوق نصیب فرمایا ہے، بڑی چھوٹی عمر سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھنے کی توفیق بخشی ہے اور ان کے محض تصنیفات ہی نہیں بلکہ علمی اور تحقیقی قابل قدر کام ہے جو اہلِ علم کے ہاں خاص طور پر تحسین و آفرین کے لائق ہیں، بہت کم عرصے میں اتنا زیادہ تصنیفی کام دیکھ کر ان پر رشک آتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے اوقات میں اور تحقیقات میں برکت عطاء فرمائیں۔

ان کے کہنے پر میں نے ان کی کتاب "احکام مدارس" کا مطالعہ کیا، ماشاء اللہ بہت مفید اور وقت کی ضرورت پر مشتمل کتاب ہے، خصوصاً ہمارا علمی طبقہ جو مدارس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے وہ سب ان مسائل کی طرف توجہ دینے کے محتاج ہیں جن کی نشاندہی موصوف نے اس کتابچے میں فرمائی ہے، مدارسِ دینیہ کو چلانا، ان کا انتظام وانصرام سنبھالنا، وہاں پڑھنا پڑھانا نہایت اہم، نازک اور پُرخطر ذمہ داریاں ہیں، ہمارے زمانے میں ان مسائل کی طرف زیادہ توجہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی غفلتیں برتی جارہی ہے جن کی وجہ سے مدارس سے وہ فوائد و ثمرات حاصل نہیں ہو رہے ہیں جو خیر القرون میں بلکہ ہمارے اکابرین کے دور میں حاصل ہوتے تھے۔

برادر محترم مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب نے انتہائی اختصار مگر جامع انداز میں ان تمام مسائل کی طرف توجہ دلا کر حل کرنے کی کوشش فرمائی ہے جو یقیناً عمل کرنے والوں اور نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بہترین توشہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ان کے علم و عمل میں مزید برکتیں عطاء فرمائیں تاکہ ہم

ان کے اسی انداز سے آئندہ بھی مستفید ہوتے رہے، اللہ تعالیٰ اس تحریر کو ان کے لئے خیر وبرکت کا باعث اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائیں۔

میں نے اس تحریر کے چیدہ چیدہ مقامات کو دیکھا، میری ذاتی رائے میں یہ تحریر بہت جامع، مستند اور مفید ہے، موصوف نے بہت عرق ریزی سے قرآن وحدیث اور مستند کتب کے حوالے سے اپنی تحریر کو علمی و تحقیقی بنایا ہے، اللہ تعالیٰ اِس کو تمام اہلِ اسلام اور بالخصوص مدارس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے لئے مفید ونافع بنائیں۔ آمین

ضیاءالدین

خادم دار الافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ از حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب زید مجدہم

الحمد لله ربّ العالمین والصلوة والسلام علی أشرف الرسل وخاتم النبیین محمد وعلی آله وصحبه أجمعین، وبعد!

قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد بیان کیے ہیں۔ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورة الجمعة:۲)

اس آیت کی رُو سے تلاوتِ آیات، تزکیہ، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت آپ ﷺ کی بعثت کے چار اہم مقاصد ہیں۔ ان چاروں ذمہ داریوں کو آپ ﷺ نے زندگی بھر بحسن وخوبی اور بطریقہ احسن واکمل پورا کیا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے بعد علمائے کرام کو اپنا وارث قرار دیا اس لیے آپ کی رحلت کے بعد اس امت کے علمائے کرام کی بھی یہی چار بڑی ذمہ داریاں ہیں جن کو زندگی کا مقصد اور نصب العین بنا کر ہمہ تن ان میں مصروف رہنا وراثتِ نبوت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ خیر القرون سے لے کر اب تک ہر دور میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے علماے کرام ہیں جنہوں نے ان ذمہ داریوں سے عہدہ بر آہونے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ اس راستے میں مصائب وآلام کی پرواہ کیے بغیر قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس اور اصلاحِ خلق کے مشن کو جاری رکھا اور محیر العقول کارنامے سرانجام دیے جس پر امت کو بجا طور پر فخر کا حق حاصل ہے۔

اسی سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس کے لیے مناسب ماحول مہیا کرنے اور طلباے علومِ نبوت کے لیے طلبِ علم کی صعوبتوں کو حتی الوسع آسان بنانے

کے لیے ان اہل علم نے مدارس کی بنیادرکھی جن میں "تلاوتِ آیات" کا فریضہ ناظرہ، حفظ وتجوید کی تدریس کی شکل میں پورا کرنی کی کوشش کی جاتی ہے۔ "تعلیم کتاب" اور "تعلیم حکمت" کا فریضہ نبھانے کے لیے عربی زبان اور دیگر علومِ آلیہ پڑھاکر قرآنِ کریم کا ترجمہ وتفسیر، احادیثِ مبارکہ اور فقہ کا درس دیا جاتا ہے جب کہ "تزکیہ نفس" کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اصلاحِ نفس پر توجہ دی جاتی ہے۔

ان مدارس کی نسبت دورِ نبوی ﷺ کی درسگاہوں "دارِ ارقم" اور "صفہ" سے جڑی ہے، تاہم موجودہ دور میں دینی مدارس نصاب ونظام اور قواعد وضوابط وغیرہ کے حوالے سے جس شکل میں موجود ہیں یہ صدیوں کے ارتقائی مراحل سے گزرنے کا نتیجہ ہے۔ تاریخ اسلام کی چودہ صدیوں میں بلامبالغہ لاکھوں کی تعداد میں مدارسِ دینیہ نے قرآن وسنت کی لازوال وبے مثال خدمت کی۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک دنیا کے ہر خطے میں دینی مدارس کے زرین خدمات اور نمایاں آثار ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مدارس ہر دور میں اُمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ثابت ہوئے، مسلمانوں کا روحانی رشتہ انہی سے جڑا رہا، قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس کا فریضہ انہی مدارس نے ہی نبھایا، یہاں کے فیض یافتہ علماء نے امامت وخطابت، وعظ وارشاد، تعلیم وتعلم اور تبلیغ وجہاد کے فرائض نبھائے۔

ہمارے برصغیر میں بھی دینی مدارس صدیوں سے قائم ہیں اوران کا نور پھیل رہاہے، تاہم اس وقت جو مدارس پاک وہند اور بنگلہ دیش کے چپے چپے میں پھیلے ہیں ان میں سے اکثر کا رشتہ انار کے درخت تلے بے سروسامانی کے عالم میں شروع ہونے والے اس مدرسے سے ہے جسے دنیا "دارالعلوم دیوبند" کے نام سے جانتی ہے۔ اس مدرسے کے بانیان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا اخلاص اور ایسی قبولیت عطا کی کہ پوری دنیا میں اس کا فیض

پھیلااور پھیل رہاہے، اس کے فیض سے پوری دنیا میں مدارس کاایساجال بچھا کہ شاید تاریخ میں کسی اورادارے کوایسی مرکزیت حاصل نہ ہوسکی جواس ادارے کواللہ تعالیٰ نے عطاکی۔ صرف ہمارے ملک عزیزپاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے قائم مدارس کی تعداد غالباًبیس ہزارسے زائد ہے جس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی تعداد کئی لاکھ ہے۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ امید ہے کہ ان دینی مدارس کانیٹ ورک جتناوسیع سے وسیع ترہوتاجائے گااتناہی ان کافیض زیادہ سے زیادہ پھیلتاجائے گااوران کے نورسے دنیاکی تاریکیاں مٹتی جائیں گی۔

اس حدتک توبات واضح ہے کہ امت کے حق میں یہ مدارس اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے جس کے گود میں بیٹھ کر علمائے کرام پوری امت کو نورِ نبوت سے منور کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک مستقل ادارہ ہونے کی حیثیت سے دینی مدارس کے بے شمار مسائل بھی ہیں جن میں شرعی احکام سے آگاہی اور پورے احتیاط سے اُن پر عمل نہایت ضروری ہے۔

دینی مدارس عوام الناس کے چندوں سے چلتے ہیں، لوگ اپنے خون پسینے کی کمائی مدارس کے منتظمین کے حوالہ کرتے ہیں، چندہ دے کروہ توبے فکرہوجاتے ہیں لیکن اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا منتظمین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں۔ اسی طرح لوگ ایک پاکیزہ جذبے سے اپنے جگر گوشے دینی مدارس کے حوالہ کردیتے ہیں اور حوالہ کرکے خود توایک بڑی حدتک سبکدوش ہوجاتے ہیں لیکن مدارس کے اساتذہ ومنتظمین کاامتحان شروع ہوجاتاہے۔ اگرکسی مدرسہ میں وسائل وافرہوں توبھی لیکن امتحان اگرکمیاب ہوں توبھی امتحان۔ اگرطلبہ زیادہ ہوں توبھی امتحان، لیکن اگر کم ہوں

تو بھی امتحان۔ طلبہ ذہین ہوں تو بھی امتحان، کمزور ہوں تو بھی امتحان۔ غرض ہر پہلو میں امتحان ہی امتحان ہے۔

بندہ نے اپنے استادِ محترم مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب مدظلہ سے بارہا یہ سنا کہ "مدرسے میں دو بڑی امانتیں ہیں: قوم کا پیسہ اور طالب علم۔ اور پھر ان میں سے بھی طالب علم زیادہ اہم امانت ہے کیونکہ اگر پیسہ بہت احتیاط سے بھی خرچ کیا جائے لیکن طالب علم کا وقت اور اس کی صلاحیت ضائع کر دی جائے تو اس پیسے کو صحیح خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہ رہا۔"

اکابر علمائے دیوبند کے اس سلسلے میں احتیاط کے عجیب واقعات ہیں، مدرسہ کے قلم سے اپنا ذاتی کام کرنے سے اجتناب برتنا، مدرسہ کے تیل سے جلنے والے چراغ سے اپنا ذاتی کام نہ کرنا، تقریبات میں بھی مدرسہ کے مطبخ سے کھانا تناول نہ کرنا، اوقات کا بیحد خیال رکھنا ان حضرات کا معمول تھا۔ اگر کبھی غیر اختیاری طور پر مدرسہ کی رقم ضائع ہوئی تو اپنی زمین بیچ کر اس کی رقم چکا دیتے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کی گائے ایک مرتبہ کسی نے مدرسہ کے صحن میں لا کر باندھ دی، کسی شخص نے اس پر اعتراض کیا تو حضرت مولانا نے اس کی جواب دہی کے بجائے وہ گائے صدقہ کر دی۔

برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندہلوی رحمہ اللہ نے آپ بیتی میں اس نوعیت کے متعدد واقعات قلمبند فرمائے ہیں جن کا مطالعہ کرنا اور بار بار پڑھتے رہنا مدارس کے مہتممین و منتظمین اور مدرسین کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہاں ان واقعات میں سے صرف دو بطورِ نمونہ پیش خدمت ہیں:

۱۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہٗ جو گویا مظاہر علوم کے بانی ہیں، کا یہ معمول میری جوانی میں عام طور سے مشہور اور لوگوں کو معلوم تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لئے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرت کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا۔ اس پر تاریخ وار ان منٹوں کا اندراج فرمالیتے تھے، اور ماہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتا تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زائد ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوادیتے، البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تھا یا مدرسہ کے کسی کام سے آتا تو اس کا اندراج نہیں فرماتے تھے۔

۲۔ مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا میں نے اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ مدرسین حضرات اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے، جب بھی وقت ملے۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی میں سے حضرت نوش فرماتے تھے، مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا۔"

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ اپنے والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی وصیت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں فرمایا:

"دیکھو بھائی! یہ میں نے مدرسہ کھولا ہے کوئی دکان نہیں کھولی ہے، اور میں اس کو ہر قیمت پر چلانے کا مکلف بھی نہیں ہوں، میں اسی کا مکلف ہوں کہ اپنی حد تک اس کو چلانے کی جتنی کوشش ہوسکتی ہے وہ کروں، اور اس کو ہمیشہ چلاتے رہنے کا بھی مکلف نہیں ہوں، لہٰذا جب تک اصولِ صحیحہ کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو چلاسکو تو چلاؤ لیکن جس دن اس

کو چلانے کے لیے اصولِ صحیحہ قربان کرنا پڑے اس دن اس کو تالا ڈال کر بند کر دینا، کیونکہ مدرسہ بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے۔"

اکابر کے چند واقعات پیش کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مدرسہ بنانا اور چلانا یقینا ایک بڑی سعادت ہے لیکن ایک بہت بڑا امتحان بھی ہے اور اس امتحان میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو ایک تو مدرسہ سے وابستہ تمام احکامِ شریعت سے باخبر ہو اور دوسرا تقویٰ کے اس معیار پر ہو کہ اُن احکام پر مکمل عمل پیرا بھی ہو سکے۔ کوئی لالچ، کسی کا خوف، یا تلبیس ابلیس اُسے حرام پر آمادہ نہ کر سکے۔ ورنہ مسائل سے جہل یا خوفِ خدا نہ ہونے کی صورت میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ مدرسہ قوم وملت کے لیے تو نعمت رہے لیکن چلانے والوں کے لیے نقمت ثابت ہو۔

اس بات کی عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ "دینی مدارس کے احکام" کے متعلق ایک جامع و مستند کتاب ہو، جس میں مدارس کے مسائل کا فقہی حل موجود ہو، تاکہ مدارس کے مہتممین و منتظمین حضرات اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب مدظلہ جو ایک جید محقق، نوجوان عالم دین ہیں، اور کئی اہم موضوعات پر اہل علم سے داد وصول کر چکے ہیں، انہوں نے اس ضرورت کا احساس کر کے اپنے محققانہ اسلوب میں جامع و مرتب انداز اور آسان زبان میں "احکامِ مدارس" کے نام سے کتاب تحریر فرمائی، جو اہل مدارس کے لیے صرف ایک قیمتی تحفہ ہی نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اُن پر ایک بڑا احسان بھی ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں مدارس سے متعلق جملہ مسائل ان کو یکجا مل سکیں گے اور ان سے استفادہ کر کے اپنے معاملات شریعت کے مطابق بنا کر اس امتحان میں کامیابی کی کوشش کر سکیں گے۔ بندہ نے مصنف موصوف کے حکم پر استفادہ کی نیت سے کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ بعض مقامات

پر کوئی مشورہ ذہن میں آیا تو وہ بھی پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے یہ اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اسے قبولیت ومقبولیت حاصل ہو گی، اہل مدارس رہنما اُصول کے طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں گے، اور مقاصدِ نبوت کو بطریقہ احسن پورا کرنے میں یہ کتاب ممد ومعاون ثابت ہو گی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دینی مدارس کے لیے کمی کوتاہی کے ازالے کا ذریعہ اور مصنف کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

محمد یحییٰ

مدرس جامعہ عثمانیہ پشاور

دیباچہ طبع دوم

"احکام مدارس" کے نام سے اس کتابچے کا جس وقت بنیادی کام شروع ہوا تھا، اس وقت اس موضوع پر کوئی جامع علمی اور مستند کتاب پیش نظر نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اہلِ علم اس موضوع کی جانب متوجہ ہوگئے اور ان کی توجہ کی برکت سے مدارس کی ذمہ داریوں سے متعلق حضرات کے لئے استفادے کا وسیع میدان سج گیا، متعدد کتابیں معرضِ وجود میں آگئیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ اس کتاب کی دوسری طباعت ہے جس میں چند ایک ضروری مسائل کا اضافہ کیا گیا ہے، پہلی مرتبہ کتاب شائع ہونے کے بعد متعدد اہل علم نے اس پر تقریظات تحریر فرمائیں جو اس دوسری طباعت میں شامل ہیں، اصول ہشتگانہ کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے، مدارس کی ترقی اور ناکامی کے اسباب اور سدباب کا مبحث بڑھایا گیا ہے[1]۔

پہلی اشاعت کے وقت کتاب کے آخر میں "آئین اکبر دار العلوم" کے نام سے ایک قدیم مدرسہ کا آئین بھی شامل کیا گیا تھا، اس کو شامل کرنے کا مقصود یہ تھا کہ اہلِ مدارس اپنے ماحول اور اہداف کے مطابق آئین بنالیں اور اسی کی روشنی میں تعلیم وتربیت کا سفر قائم رکھیں، اس دوسری طبع میں اس کو شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تو اس کو فی الحال ختم کیا گیا، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وفاق المدارس کی جانب سے "مدارس کے لئے نظام تعلیم وتربیت" کے نام سے متوسط حجم والی کتاب شائع ہوئی جس سے یہ ضرورت بحسن وخوبی پوری کی جاسکتی ہے، اس لئے اب اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔

---

[1] اس لئے علمی امانت کے طور پر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جن ارباب علم وفضل حضرات نے اس کتاب پر تقدیم یا تقریظ تحریر فرمائی ہے، ان کے سامنے پہلا ہی نسخہ موجود تھا جس میں یہ اضافی مباحث شامل نہیں تھے، لہٰذا ان نئی مباحث میں اگر کوئی علمی سقم ہو تو وہ اس ناکارہ ہی کی کوتاہی شمار ہوگی۔

کسی تصنع و تکلف کے بغیر عرض ہے کہ ان حروف کے ناکارہ راقم کے خیال میں اس کتابچے کا اصل مصرف یہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے مدرسے میں یہ موجود ہو، اسی کی روشنی میں مدارس کا نظام چلایا جاتا رہے، البتہ کسی قسم کا کوئی سقم سامنے آئے تو مستند دار الافتاؤں سے رجوع کر کے عملدر آمد کی جائے۔

دلی دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائیں اور جن نیک جذبات کے تحت یہ سطور سیاہ کئے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی نصیب فرمائیں۔

عبید الرحمان

۲۳ ذی القعدۃ ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

الحمدُ لله جلّ وعلا، والصّلاةُ والسّلامُ علیٰ سیّد الأصفیاء وخاتم الأنبیاء وعلیٰ آله وأصحابه شُموس الفضل وأعلام الهدیٰ.

باہر دنیا کی صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو لیکن کم از کم برِصغیر کی حد تک یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہاں کے دینی مدارس دینِ اسلام کے قلعے ہیں، یہاں کے رہنے والوں میں جو کچھ دین وشریعت کا مزاج ومذاق باقی ہے یا ان کے دل ودماغ کے صفحات پر اسلام کی جو کچھ اہمیت برقرار ہے یا اجتماعی میدان میں کچھ مذہبی اثرات ونقوش ابھی تک ثبت ہیں، عالمِ اسباب کی حد تک اس کا بڑا اور بنیادی سبب یہی دینی مدارس ہیں، یہاں کے ماحول میں دینِ اسلام کے جتنے شعبے مصروفِ عمل ہیں غور کرنے کے بعد اس کا آخری سرا کسی نہ کسی طرح مدرسہ سے جاکر جڑتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ خدمتِ دین کے تمام شعبے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسی سمندر علم وعمل سے پھوٹتے اور معاشرے میں پھیلتے ہیں اس لئے یہاں کے ماحول ومعاشرے میں انفرادی واجتماعی طور پر جو کچھ اسلامی نقوش واثرات باقی ہیں اس میں ان دینی مدارس کا بڑا اور بنیادی کردار ہے اور اسی لئے ان مدارس کو دین کے قلعے کہا جائے تو بے جا نہیں ہے۔

البتہ قوموں اور ملکوں کی زندگی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جس میں ان کا قلعہ تک دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، کسی قوم کے سرنگوں ہوجانے، دشمن کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہوجانے، اور اپنی قومی یا مذہبی تشخص کھوجانے کا آخری وقت یہی ہوتا ہے جب ان کی بھاگ دوڑ کا ٹھکانہ مخالف قوم کے قبضہ میں چلا جاتا ہے، نیز قلعہ عموماً تب ہی فتح ہوجاتا ہے جب اندرونِ قلعہ قوم وملت سے خیانت کرنے والے کچھ ایسے

افراد موجود ہوں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر مخالف قوم کے ساتھ تعاون کریں ورنہ محض باہر کے زور پر بہت کم قلعوں پر قبضہ جمانے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے البتہ اگر باہر سے بھی بھرپور قوت برسرِپیکار ہو اور اندرون خانہ بھی ان کے کچھ ہم خیال وہم کام افراد مصروفِ عمل ہوں تو پھر اس قلعہ کے فتح ہو جانے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی بلکہ آج یا کل ہی میں اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔

بس یہی کچھ حال ہمارے دینی مدارس کا بھی ہے کہ دین دشمن طاقتیں خواہ کتنے ہی زور آور کیوں نہ ہوں لیکن جب تک ہمارے مدارس کا اندورنِ خانہ نظم وانتظام درست ہو اور ہمارے بنیادی اہداف(اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے شریعت کی اتباع وخدمت) کے مطابق بالکل درست سمت ورفتار میں جارہی ہوں تو محض باہر کی مخالف طاقتیں ہم کو زیر زبر کرنے ، ہماری حیثیت ڈھانے یا کم کرنے میں ان شاء اللہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے:

{ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ }

[محمد: ۷]

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

{وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ} [آل عمران: ۱۲۰]

اس بات سے انکار نہیں ہے کہ دینی نظام مملکت نہ ہونے کی وجہ سے امتِ مرحومہ کو علمی وعملی ہر لحاظ سے نہایت انحطاط کا سامنا کرنا پڑا اوراس کی وجہ سے دین کی اہمیت اور اس پر تن من اور دھن کے قربانی دینے اوراس کو اپنے لئے ذریعہ فخر و سعادت تصور کرنے کی روایت کمیاب ہوتی چلی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود یہ امت نہ

کبھی بالکل بانجھ رہی ہے نہ ہے، جنگل کبھی شیروں سے خالی نہیں ہوتا، پہلے کی بنسبت دین کے نام لینے والوں اور اس راہ میں کسی حد تک قربانی دینے والوں کی تعداد بھی الحمد اللہ کچھ زیادہ کم نہیں ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ مدارس اور خدمتِ دین کے دیگر شعبہ جات، جس کثرت وتواتر کے ساتھ قائم ہیں اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ آج نہیں بلکہ بہت پہلے دینِ اسلام پورے معاشرے میں اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ نافذ ہو چکا ہوتا، اگر کلی طور پر نظامِ مملکت دین کے مطابق نہ بھی ہوتا تو بھی کم از کم پہلے کی بنسبت معاشرے میں منکرات ومعاصی ظاہر وغالب نہ ہوتے، لیکن مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرنے سے بالکل قاصر ہے، خدا کی زمین پر پہلے کی بنسبت اب بہت زیادہ منکرات کا سیلاب امڈتا چلا آرہا ہے! شریعت کے احکام اور مسنون طریقے ہی ہیں جو عملی طور پر مہجور ہوتے جارہے ہیں۔

اس کے اسباب وعناصر کیا ہیں؟ اس کی کوئی خواہ کچھ بھی توجیہ کرے وہ اپنی جگہ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسے بڑے اور اہم امور کا عموماً کوئی ایک سبب نہیں ہوتا بلکہ مختلف اسباب جمع ہو جانے کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے دیگر اسباب کا ہونا بعید نہیں ہے لیکن ایک بنیادی اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ مدارس سمیت دینِ متین کی خدمت کرنے والے اداروں اور ان میں کام کرنے والے خوش نصیب افراد میں اب اس کام کی اصل روح باقی نہ رہی بلکہ سب جگہ کلی طور پر نہ سہی، تو جزوی طور پر رسمیت ہی کے مظاہر نظر آتے ہیں، اب اکثر کاموں اور خدمتوں کی مثال جسمِ بے روح اور نعشِ بے جان سے زیادہ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ جب کسی چیز کی اصل روح نکل جاتی ہے تو محض اس کے ظاہری ڈھانچے سے کوئی توقع رکھنا سراب خیال ہی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

رہ گئی رسمِ اذان، روحِ بلالی نہ رہی

فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنیٰ وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے (جوابِ شکوہ)

دنیا جہاں کے دیگر تمام شعبوں کی طرح مدارس میں بھی جو کچھ منکرات وخامیاں پائی جارہی ہیں اس کے بنیادی طور پر دو اسباب ہیں:

۱۔ کم علمی وجہالت۔ ۲۔ ہٹ دھرمی اور عداوت۔

بعض گناہوں کا تو اسی لئے ارتکاب ہو جاتا ہے کہ کرنے والے کو یہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کوئی گناہ کا کام ہے یا نہیں؟ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں یہ شریعت کی نگاہ میں گناہ ہے تو وہ کبھی اس کا ارتکاب نہ کرے گا لیکن محض کم علمی وجہالت کی وجہ سے عمل انجام دے رہا ہے، گناہوں کے ارتکاب کرنے کا دوسرا بڑا ظاہری سبب ہٹ دھرمی اور خواہشات کی تابعداری ہے کہ مسئلہ معلوم ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ عمل میں کرنے جارہا ہوں وہ شریعت کی نظر میں گناہ اور ناپسندیدہ ہے لیکن اس کے باوجود نفس کی خواہش یا کسی دوسرے مفاد کی خاطر اس کا ارتکاب کر جاتا ہے، مدارس کے ماحول میں جو کچھ منکرات کئے جاتے ہیں اس کا تعلق عام طور پر پہلے ہی سبب کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اخلاص وقربانی کے ساتھ کام کرنے کے باوجود غلطیاں ہو جاتی ہیں اور بہت سے افراد تنبیہ کے بعد فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور غلطی کا تدارک کرکے آئندہ کے لئے اس سے بالکل باز آجاتے ہیں۔

دوسرے سبب سے ہونے والے منکرات پہلے کی بنسبت کافی کم نہں لیکن جو

کچھ ہے بھی، تو اس کا علاج بھی محض مسئلہ بتانا نہیں ہے ،ایسے میں وفاق المدارس جیسی تنظیمات ہی کی خدمت میں یہ دست بستہ درخواست کی جاسکتی ہے کہ وہ مدرسہ بنانے اور چلانے کے لئے کوئی معقول و مناسب معیار مقرر کرے کہ کن صفات وامتیازات کے حامل افراد کو وفاق کی طرف سے مدرسہ بنانے کی اجازت ہونی چاہیئے اور پھر مختلف سطح کے مدارس کو بنانے اور چلانے کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے؟ نیز جس طرح کوائف وغیرہ کے جانچ پڑتال کے لئے مختلف عصری ودینی اداروں کی علانیہ اور خفیہ دورے ہوتے ہیں ان کی کارکردگی کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے تاکہ طے شدہ نظم وانتظام کو اچھی طرح قائم رکھا جاسکے اور مطلوبہ اہداف ونتائج خوب سے خوب تر طریقے سے حاصل کئے جاسکیں، یوں ہی مدارس میں مقررہ نظام وشرائط کی پابندی اور عملی تطبیقی طور پر جائزہ لینے کے لئے اگر کوئی مناسب ومعقول نظم بنانا ممکن ہو تو اس سے بالکل بھی دریغ نہ کیا جائے، غرض کوئی بھی ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے کہ کم از کم وفاق المدارس یا دیگر تنظیمات مدارس سے ملحقہ مدارس میں شرعی منکرات وخامیوں کا تحقق کم سے کم تر ہو جائے اور وہاں کا تعلیمی وتربیتی نظام ممکنہ طور پر بہتر سے بہتر تر بنایا جاسکے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس کے اندر ہونے والی کوتاہیوں کی ساری ذمہ داری اربابِ اہتمام کے سر ڈالنا بھی قطعاً نامناسب ہے، حقیقت یہ ہے کہ مہتمم وناظم ہو یا مدرس ودیگر عملہ، سب کے سب اپنی قدرت واختیار کے مطابق اس کے ذمہ دار ہیں، بخاری وغیرہ کتبِ صحاح کی مشہور روایت سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ ہر کوئی اپنی حد تک راعی ونگران ہے اور ہر شخص اپنے اختیار کی حد تک مسئول وذمہ دار ہوگا، لہٰذا اگر ناظم و مدرس یا دیگر عملہ بھی کسی منکر کے ختم کرنے یا اس کو کم سے کم تر بنانے میں کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں تو اس میں اپنا کردار ضرور ادا کرلینا چاہیئے، قدرت واستطاعت رکھتے ہوئے

بھی منکرات پر نکیر کرنے اور حکمت ودانائی کے ساتھ اس کو ختم کرنے کے بجائے اس سے جی چرانا اور کسی خاص شخص یا منصب پر اس کا سارا نزلہ ڈالنا کم ہمتی اور حرمانِ نصیبی کی نشانی بھی ہے اور اپنے فرضِ منصبی میں کوتاہی کا ثبوت بھی، پھر اس طرح اگر عملے کا ہر ہر فرد دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے لگ جائے گا تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلنے والے نیک لوگوں کا نصب العین تو وہی ہے جو آیتِ تمکین میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

{الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ} [الحج: ٤١]

ہم کو اگرچہ پورے ملک وسلطنت میں تمکین حاصل نہیں ہے لیکن اپنے اداروں اور مدارس کی حد تک تو الحمد للہ ہمیں استطاعت حاصل ہے اس لئے پورے ملک میں نہ سہی، کم از کم مدرسہ کی چار دیواری کی حد تک تو نظام صلاۃ ونظام زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دینے کا اچھی طرح مظاہرہ کرنا ضروری ہے، لیکن بہت مدارس میں دیکھا جاتا ہے کہ ان چار مقاصد میں بھی طرح طرح کی کوتاہیاں برتی جاتی ہیں۔

کتاب لکھنے کی ترتیب یہ بنی کہ پہلے موضوع سے متعلق جو کچھ مسائل عام طور پر پیش آتے ہیں ان کو جمع کیا گیا، اس کے بعد مختلف مدارس سے وابستہ حضرات سے بات چیت ہوتی رہی، متعدد مدارس کے مسائل ومشکلات اور وہاں رائج کچھ قابلِ اصلاح باتوں کو جمع کیا گیا، اس کام کے لئے مختلف مدارس وجامعات کی زیارت کرنے کا بھی موقع آیا اور یوں تمام باتوں کو فقہی اصول وضوابط اور فقہائے کرام کے جزئیات وتفریعات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی، تحریر تیار ہو جانے کے بعد مختلف اہلِ علم کو

اصلاح و تصحیح کی غرض سے دکھائی گئی تا کہ اس تحریر کی غلطیوں اور کمزوریوں کی اصلاح ہو سکے، ان میں سے جن اہل علم نے کتاب کو بالاستیعاب ملاحظہ فرما کر کئی جگہ کی غلطیوں کو درست فرمایا، ان میں سے حضرت مولانا مفتی محمد یحیٰ صاحب زید مجدہم (جامعہ عثمانیہ پشاور) کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے جنہوں نے پورے اخلاص و محبت اور بڑی فراخدلی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے کافی وقت نکال کر اس ناکارہ کی تحریر کو پڑھا اور متعدد جگہوں پر غلطیوں کی اصلاح فرمائی اور ساتھ کچھ مفید تجاویز بھی دیں، حضرت مولانا مفتی ضیاء الدین صاحب زید مجدہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ اپنی مصروفیات کی قربانی دیکر کتاب کو ملاحظہ فرمایا اور ساتھ حوصلہ افزائی کے لئے چند کلمات بھی ارسال فرمائے، اسی طرح اپنے احباب میں سے مولوی عادل رضا صاحب زید مجدہ نے کئی مرتبہ کتاب کو تحقیقی و تنقیدی نظر سے دیکھا، مولوی سبحان اللہ پشاوری صاحب زید مجدہ نے بھی اہتمام کے ساتھ اس کو دیکھا اور متعدد مشورے دئے، اس کے علاوہ بھی متعدد احباب نے اس باب میں پورے تعاون کا ثبوت دیا، احقر دل وجان سے ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کی مساعی کو قبول فرمائیں اور اس علم دوستی پر اللہ تعالیٰ ان کو دنیا و آخرت میں بہترین بدلے عطاء فرمائیں۔

اپنی اس بے ترتیب عرض کو ختم کرنے سے قبل قارئین اہلِ علم سے یہ التجاء کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس وقت صرف "احکام مدارس" ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خدمتِ دین کے دیگر شعبہ جات میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر ہر شعبہ کے نظریاتی و عملی سرحدات کا تعین ہو جائے، اس میں رائج کوتاہیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے اور ہر شعبہ کے اصل روح کو زندہ سلامت رکھنے کی انتھک جد وجہد کی جائے کہ عصرِ حاضر میں یہی خدمتِ دین کے شعبہ جات اور اس میں اپنی پوری توانائیاں

صرف کرنے والے لوگ ہی اس امت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں، یہاں سے اگر اصلاح کی لہر شروع ہو گئی تو پوری امت میں ایک صالح دینی انقلاب کا آنا کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔

اس وقت جبکہ دینِ اسلام ہر طرح سے غربت کا شکار ہے کوئی اجتماعی طاقت و حکومت پورے دین کو اپنے ہاں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہے اس میں یہی غنیمت ہے کہ خدمت دین کے شعبوں کو ہر لحاظ سے فعال ومتحرک بنایا جائے جس کی پہلی سیڑھی یہی ہے کہ خدمتِ دین کی کسی بھی شکل میں کسی معصیت ومنکر کا عمل دخل نہ رہے اور سارے کام اخلاص و دیانت کے جذبے سے سرشار ہو کر شرعی ضوابط کی روشنی ہی میں انجام پائیں، لہٰذا "احکام مدارس" کی طرح بلکہ اس سے بہتر طرز پر "احکام دعوت وتبلیغ"، "احکام سیاست وحکومت"، "احکام تصوف وخانقاہ" اور "احکام جہاد وقتال "وغیرہ کی بھی ضرورت ہے، امت کی اس غربت ومسکنت کے عالم میں جو خوش نصیب افراد اس ذمہ داری کو علمی اور عملی طور پر نبھانے کی کوشش فرمائیں گے وہ ان شاء اللہ دین متین کے بڑے خادم اور امت کے بہی خواہ شمار ہوں گے:

وقتِ فرصت ہے کہاں؟ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ ایک مقدمہ اور کل پانچ ابواب ہیں، مقدمہ میں مدارس کی اہمیت، مدرسہ قائم کرنے اور اس کو چلانے کے فضائل اور منصب اہتمام کی لیاقت ومعیار پر گفتگو کی گئی ہے، پہلے باب میں چندہ کرنے کا حکم، طریقہ کار، شرائط وآداب اور چندہ کو مدرسہ میں خرچ کرنے کے متعلق متعدد مسائل کا ذکر کیا گیا ہے، دوسرے باب میں ارباب اہتمام کے حقوق، اختیارات اور مختلف جہات سے ان کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، تیسرے باب میں مدرس کے حقوق وفرائض، مدرس کے عزل

ونصب، ان کی تنخواہوں وغیرہ کے متعلق کچھ تفصیلات کا ذکر کیا گیا ہے، بابِ چہارم میں طلبہ سے متعلق مختلف نوعیت کے مسائل ذکر کئے گئے ہیں جبکہ پانچویں اور آخری باب میں مدارس سے متعلق چند اہم متفرق مسائل کا ذکر کیا گیا ہے، نیز کتاب کے آخر میں مردان کے مشہور قدیمی درس گاہ "اکبر دار العلوم مردان" کا آئین بھی شامل کیا گیا ہے جو کسی زمانے میں آسمانِ علم کا درخشاں ستارہ سمجھا جاتا تھا[1] اور آج اس کا صرف نام ونشان ہی باقی ہے۔

یہ ناکارہ اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ مدارس کا موجودہ نظام چونکہ قدیم زمانے میں رائج نہیں تھا اس لئے اس باب کے زیادہ مسائل اس نوعیت کے ہیں جن میں قدیم فقہائے کرام کا کوئی واضح جزئیہ نہیں پایا جاتا بلکہ یا تو دیگر اشباہ ونظائر سے مسئلہ معلوم کیا جاتا ہے اور یا قواعد وضوابط کی روشنی میں کسی حکم تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح جدید قسم کے مسائل میں اونٹ کافی عرصہ بعد ہی کسی خاص کروٹ بیٹھتا ہے، مولانا عبد الماجد دریابادی صاحب مرحوم کے بقول اس تحریر کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ اپنے زمانے کا کوئی محقق وفقیہ اپنے ہمسروں اور ہم عصروں کے سامنے کوئی تحقیق پیش کرے بلکہ اس کی حیثیت تو ایک ادنیٰ طالب علم کے آموختہ کی ہے وہ بھی کچھ کچا کچھ پکا، اس لئے اہلِ علم کی خدمت میں دست بستہ

---

[1] حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی، مولانا محمد حسن جان، مولانا محمد اسرائیل صاحب (رحمہم اللہ) اور اس کے علاوہ کئی مشاہیر اہلِ علم یہاں تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور چند ہی سالوں میں اس چشمہ علم سے بڑے نامور اہلِ علم وعمل سیراب ہوئے، اس کی مختصر تاریخ کے لئے حضرت مولانا محمد حسن جان صاحب شہید رحمہ اللہ کے خود نوشت سوانح "فانی زندگی کے چند ایام"۔

درخواست کرتا ہوں کہ اگر اس تحریر میں علمی فقہی یا کسی بھی لحاظ سے کوئی سقم ہو تو ضرور اس ناکارہ کو مطلع فرمائیں تاکہ غور و فکر کرکے اس کی بروقت تصحیح کی جاسکے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی کاوش کو اپنے بارگاہ میں قبولیت سے نوازے اور جس نیک جذبہ کے تحت یہ صفحات سیاہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کرے کہ اس کی تکمیل ہو جائے، وہ بہت قدر دان اور بڑا رحیم و کریم ہے۔

ناکارہ عبید الرحمٰن، (مقیم حال) دارالافتاء جامعۃ اصحاب الصفہ، مردان

٢٦ذی القعدة١٤١ھ

****

مقدمہ

- مدرسہ قائم کرنے کا حکم اور اس کی اہمیت
- قائم کرنے اور اس کو چلانے کے فضائل

مدارس کی اہمیت

حضور نبی کریم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ان کی دین کے احکام و تعلیمات کی تعلیم و تعلّم کا انتظام فرماتے تھے، چنانچہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے جو جانکاہ اور مشکل ترین حالات تھے لیکن مشکلات کی اس بھٹی میں بھی آپ ﷺ نے اس اہم کام سے غفلت نہیں فرمائی بلکہ جگہ جگہ مختلف شکلوں میں دین کی تعلیم و تعلم کی خدمت کا سلسلہ جاری تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ بنت خطاب کے گھر بھی ایسا انتظام کیا گیا تھا (جس کا ایک نتیجہ یہ ظاہر ہوا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول فرمایا) "دار ارقم" میں بھی یہی کچھ کام ہو رہا تھا۔

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد جب خلافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی تو دیگر امور کی طرح اس اہم کام میں بھی خوب پیش رفت ہوئی اور وہاں مدینہ منورہ کی محدود آبادی میں جگہ جگہ دینی علم کے حلقے قائم ہونے لگے جہاں نازل ہونے والے قرآن کریم اور حضور ﷺ کی احادیث وارشادات کی تعلیم و مذاکرات ہوتے تھے، یہ سلسلہ صرف مدینہ منورہ کے خوش نصیبوں کے لئے میسر نہ تھا بلکہ جزیرۃ العرب اور باہر دنیا کے لوگ بھی کوئی تن تنہا اور کوئی وفد کی شکل میں آکر یہاں اپنی دینی ضرورت اور مذہبی پیاس پوری کرکے چلے جاتے تھے، تاریخ وسیرت کی کتابوں سے ایسی متعدد مقامات کا سراغ ملتا ہے جہاں تعلیم و تعلم کا تسلسل جاری تھا۔[1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: حضرت مولانا قاضی محمد اطہر مبارک پوری صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت" جس میں مولف نے بڑی محنت سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ان مقامات کی نشاندہی فرمائی ہے جہاں مختلف صورتوں میں دینی علوم کے سیکھنے سکھانے کا کام ہوتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ دینی علم و تعلیم کے لئے مدارس قائم کرنا اپنے اصل کے لحاظ سے ایک سنت بلکہ بنیادی اور نہایت اہم سنت ہے جس سے حالات کی سخت مجبوری اور ظلم وجبر کے جانکاہ حالات میں بھی غفلت یا تاخیر نہیں کی گئی، گو موجودہ زمانے میں مدرسہ کی موجودہ شکل اس زمانے کے تعلیمی اداروں کی طرح بالکل یکسا نہیں تھی لیکن غور کیا جائے تو دونوں جگہوں کے اغراض واہداف میں سر مو فرق نہیں، وہاں بھی لوگوں کی دینی ضروریات پوری کرنا مقصود تھا اور یہاں بھی لوگوں کو ان کے دینِ متین کے احکام ومسائل سے روشناس کرانا اصل ہدف ہے جس کے لئے موجودہ زمانے کے ظروف وحالات کے مطابق نظم بنایا جاتا ہے، اس لئے اپنے اصل اور جوہر کے لحاظ سے یقیناً یہ ایک سنت بلکہ اہم سنت ہے۔

اس کے علاوہ جہاں دینی فرائض واحکام کی تکمیل مدارس پر موقوف ہو اور اس کے علاوہ کوئی معتد بہ اور قابل اعتماد ذریعہ موجود نہ ہو جیسا کہ ہمارے ہاں عموماً یہ صورت حال پیش آرہی ہے، وہاں مدارس کا قیام صرف مسنون ہی نہیں بلکہ اجتماعی فریضہ ہے، پھر افراد کے لحاظ سے اگر کہیں اس ذمہ داری کی صلاحیت رکھنے والا کوئی ایک فردِ فرید ہو تو اس کے ذمہ مدرسہ کا قیام اور دینی فرائض کی تکمیل فرضِ عین ہو جائے گی اور اگر ایک سے زیادہ افراد میں یہ صلاحیت موجود ہو تو سب پر اجتماعی طور پر یہ فرض ہو جائے گا، جن افراد میں اس ذمہ داری کی صلاحیت موجود نہ ہو اور خدشہ ہو کہ اہتمام سنبھالنے کے بعد اس منصب کے شرعی تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کو پوری طرح نہیں نبھا سکے گا بلکہ اس میں کوتاہیاں برت لے گا، اس کے لئے ایسا اقدام کرنا شرعاً مکروہ ہے، ایسے افراد کی ذمہ داری ہے کہ اہتمام کا بوجھ سر پر لینے کے بجائے متعلقہ دینی مدارس میں اپنی استطاعت کے مطابق خدمات انجام دیتے رہے، یا اگر ایسے ادارے موجود نہ ہوں تو

اس صلاحیت سے بہرہ ور افراد کو اس کام کی طرف متوجہ کرکے مقدور بھر ان کا تعاون کرتے رہیں۔

مدرسہ قائم کرنے اور چلانے کے فضائل

کسی بھی دینی کام میں دلی رغبت اور حوصلہ پیدا ہونے اور اس راہ میں پیش آمدہ مشقت ومصائب برداشت کرنے کے لئے ان آیات وروایات کو ملاحظہ رکھنا نہایت مفید ہے جن میں اس کام کے دنیوی / اخروی فضائل وفوائد کا ذکر ہوتا ہے، اسی ترغیب وترہیب سے کام کے ساتھ دلی جذبہ اور مضبوط ولولہ پیدا ہوتا ہے اور نفسیاتی طور پر انسان کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس بات کا خواہاں ہوتا ہے کہ وہ فوائد ونتائج کو دیکھ لے جو اس کام کے کرنے کے بعد اس کو ملیں گے اور ان فوائد کو دیکھنے کے بعد ہی وہ پوری بصیرت اور تندہی کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی انسان کی اس طبیعت ومزاج کا لحاظ رکھا گیا اور کئی جگہوں پر اخروی نعمتیں و فوائد کے ساتھ ساتھ دنیوی فوائد کو بھی بیان کیا گیا۔

لہٰذا زیر نظر موضوع میں بھی یہ عنوان مفید اور مناسب ہے لیکن چونکہ مدارس کے فوائد و نتائج اور ان کے انتظام وانصرام کا زیادہ تر تعلق اہلِ علم کے ساتھ ہے اور اس تحریر کے اصل مخاطب بھی یہی حضرات ہیں اس لئے اس میں زیادہ تفصیل کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، اجمالاً اتنا ذکر کرنا کافی ہے کہ:

الف: مدارس تعلیم قرآن وتعلیم دین کے مراکز ہیں اور عموماً یہی سے وہ افراد پیدا ہوتے ہیں جو معاشرہ میں لوگوں کے دل وباطن کے تزکیہ کا کام کرتے ہیں جبکہ یہی کچھ حضور نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے مقاصدِ بعثت ہیں، اس لئے یہ دینی مدارس مقاصد بعثت کی تکمیل کے اہم مراکز وذرائع ہیں۔

ب: قرآن کریم اور دینی مسائل کے تعلیم وتعلم کے متعلق جتنے فضائل ثابت ہیں، مدارس بھی ان کے مصداق ہیں کیونکہ یہی ان مدارس کا مقصد ہے اور واقعی طور پر مدارس میں یہ عظیم خدمت انجام دی جاتی ہے۔

ج: مدارس میں قرآن وحدیث اور دین اسلام کے احکام ومسائل کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے، لہٰذا نصرتِ دین کے متعلق جتنے عمومی فضائل وارد ہوئے ہیں، ان کا ایک بڑا مصداق یہ مدارس بھی ہیں، مثلاً:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ }

[محمد : ٧]

{وَلَيَنْصُرَنَّ اللهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيز} [الحج : ٤٠]

علامہ زروق مالکی رحمہ اللہ نے حدیث مبارکہ "الدین النصیحۃ" کی ایک مفید شرح لکھی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ نصرت دین کے تین (بڑے) اسباب وذرائع ہیں: جہاد۔ امر بالمعروف۔ اور دینی علوم اور ضروری نوعیت کے علوم جو بقاء دین کا سبب ہیں۔

نصرة الدين بأمور ثلاثة: الجهاد، وشروطه معروفة. والأمر بالمعروف.. والثالث من وجوه النصرة: القيام بالأسباب الموجبة لبقائه من علم أو عمل. فالعلم كتاب الله وسنة رسوله عليه الصلاة والسلام وما ولاهما من فقه ولغة ونحوها.[1]

---

[1] النصيحة الكافية لمن خصه الله بالعافية،الفصل الثاني نصرة الدين،ص٣.

د:احادیث مبارکہ میں احیاء دین اور احیاء سنت کے بڑے فضائل بیان کئے گئے ہیں ، مدارس میں دینی علوم کی تعلیم وتربیت کی وجہ سے یہ دونوں مقاصد بحمد اللہ بڑی حد تک انجام پارہے ہیں اس لئے ان فضائل کے عموم میں دینی مدارس داخل ہیں، مثلاً:

عن الحسن قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:من جاءه الموت وهو يطلب العلم ليحيي به الإسلام فبينه وبين الأنبياء في الجنة درجة واحدة.[١]

عن الحسن قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: رحمة الله على خلفائي. ثلاث مرات قالوا: ومن خلفاؤك يا رسول الله؟ قال: الذين يحيون سنتي ويعلمونها عباد الله.[٢]

س:علم دین اور خیر کے نشر واشاعت کے متعلق جتنے فضائل ثابت ہیں، چونکہ مدارس میں بھی یہ خدمت انجام دی جاتی ہے اس لئے مدارس کے لئے بھی یہ فضائل ثابت ہوں گے ان شاء اللہ، اس نوع کی احادیث بہت ہیں جس کو فضائل کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً، حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ:

عن الحسن قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:من الصدقة أن يتعلم الرجل العلم فيعمل به ثم يعلمه.[٣] عن الحسن قال: قال

---

[١] جامع بيان العلم وفضله،باب جامع في فضل العلم،رقم الحديث:٢١٩،ج١ص٢٠٧.

[٢] جامع بيان العلم وفضله،باب جامع في فضل العلم،رقم الحديث: ٢٢٠،ج١ص ٢٠٧.

[٣] جامع بيان العلم وفضله، باب جامع لنشر العلم،ج١ص٤٩٣.

رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم: ما تصدق رجل بصدقة أفضل من علم ينشره.[1]

اہتمام کی لیاقت ومعیار

ہمارے فقہاء حنفیہ کے نزدیک کسی بھی وقف کے متولی بننے کے لئے بنیادی طور پر دو شرائط ہیں:

ا۔ متولی امین یعنی امانت دار اور قابل اعتماد ہو۔

۲۔ جس وقف کا متولی بنا ہو، اس کے تقاضوں اور ضروریات کو سمجھنے اور پھر بحسن وخوبی اس کو انجام دینے کی اہلیت ہو۔

یہ دونوں شرائط نہایت اہمیت کی حامل ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کو متولی بنانے میں متعلقہ وقف کے مصالح ومنافع بروئے کار لانے کی امید نہیں کی جاسکتی بلکہ متعدد دینی واخلاقی خرابیوں کا خدشہ ہے چنانچہ اگر کسی وقف کا متولی امین نہیں ہو گا تو اوقاف کے مال میں بھی خیانت کا مرتکب ہو گا جس کے مفاسد محتاج بیان نہیں ہیں، اگر وہ امانت دار تو ہے لیکن وقف کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھتا نہ ہو یا سمجھتا تو ہے لیکن عملی طور پر اس کو انجام دینے کی صلاحیت نہ ہو تو دونوں صورتوں میں متولی بنانے کا غرض کبھی پورا نہیں ہو گا بلکہ عضو معطل کی طرح بے کار اور غیر موثر رہے گا جس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ خود یہ وقف کا بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ معاشرہ کو نصیب نہیں ہو گا اور شاید آئندہ کے لئے بھی اوقاف کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا۔

لہٰذا مدرسہ کے مہتمم بننے کے لئے بھی ان دونوں شرائط کی رعایت رکھنا لازم

---

[1] جامع بيان العلم وفضله، باب جامع لنشر العلم ،ج١ص ٤٩٧.

ہے کہ وہ معاشرت ومعاملات کی حد تک امانت دار اور دیانت دار ثابت ہو، اور اس طور وتعامل میں کسی بے راہ روی اور مالی خیانت کا شکار نہ ہو تاکہ آئندہ مدرسہ کے امور میں بھی اس پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکے، اسی طرح اس بات کا لحاظ رکھنے سے بھی کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ مدرسہ بنانے، چلانے اور مدرسہ کے حوالہ سے اندورونی وبیرونی معاملات کو سمجھنے اور پھر اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دینے کی استعداد موجود ہو، ورنہ تو محض امانت داری، نیک نامی یا دین داری سے مدرسہ کا مقصود پورا نہیں ہو سکتا۔

رہا یہ قضیہ، کہ مدرسہ کے تقاضے اور ضروریات کیا کیا ہیں؟ تو اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ایک تو اس لئے نہیں ہے کہ ہر ماحول اور زمانے میں اس کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اس کے لئے کوئی دو دو چار جیسا واضح معیار مقرر کرنا مشکل اور نامناسب ہے اور دوسری اس لئے بھی کہ محض نظریاتی طور پر اس بات کو حل کرنے کی بجائے مناسب اور احوط راستہ یہی ہے کہ جہاں اس قسم فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو وہاں کے متبع سنت اہل علم حضرات ہی سے یہ فیصلہ کروایا جائے کہ وہ حالات کو دیکھنے اور فیصلہ کرنے کے لئے دیگر تمام مبادی اور ضروریات کو پرکھنے کے بعد کوئی مناسب فیصلہ کریں۔

* *

بابِ اول:

- چندہ کے مسائل واحکام
- اربابِ اہتمام کے پاس چندے کے رقوم کی فقہی تکییف
- چندہ خرچ کرنے سے متعلق اصول وضوابط

چندہ کے متعلق مسائل واحکام

مدرسہ کے مصارف واخراجات پوری کرنے کے لئے مختلف ذرائع آمدن اختیار کئے جاسکتے ہیں، مثلاً مدرسہ کی طرف سے مختلف نفع بخش اور قابل اعتماد کاروبار میں رقم لگانا، مکانات ودکانات کرایہ پر دینا، پڑھنے والے طلبہ سے فیس وصول کرنا، وغیرہ۔ ان میں سب سے زیادہ رواج پانے والا طریقہ کار چندہ وصول کرنے کا ہے کہ مخیر حضرات سے مدرسہ کے لئے تعاون کی اپیل کی جائے اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق امداد کرتے رہے۔

چندہ کرنے کا ثبوت اور حکم

حضور نبی کریم ﷺ مختلف مواقع پر مسلمانوں میں عمومی طور پر دین کے مختلف تقاضوں کے لئے امداد کا اعلان فرماتے تھے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بڑی منافست اور مقابلہ کے انداز میں اس اعلان پر لبیک کہتے تھے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے تھے، چنانچہ مختلف غزوات میں ضرورت کے وقت بھی عمومی طور پر یہی اعلان فرمایا اور مختلف وفود کو جب کھانے پینے یا کپڑے وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو بھی مختلف صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو ترغیب یا حکم دیا کرتے تھے کہ وہ اس کا انتظام کریں، بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی مدیون آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ نے اس کے لئے بھی مسلمانوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أصيب رجل في عهد رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم في ثمار ابتاعها، فكثر دينه، فقال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم: تصدقوا عليه. فتصدق الناس عليه.[1]

اس لئے دینی خدمات کے لئے ضرورت کے وقت چندہ کرنا سنت ہے تاہم اس میں شرعی حدود وضوابط کالحاظ رکھنالازم ہے جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ذکر کی جاتی ہے۔

چندہ کے متعلق علماءاور عام مسلمانوں کی ذمہ داری

دینی مدارس ہوں یا اس کے علاوہ دیگر دینی خدمات کے ادارے، یہ جو دینی خدمات انجام دیتے ہیں وہ امت کے ذمہ فرض کفایہ ہے جس کی ذمہ داری پوری امت پر اجتماعی لحاظ سے عائد ہوتی ہے، ان اداروں کے ذمہ داروں کا پوری امت پر احسان ہے کہ اس اجتماعی فریضہ کو اپنے کندھوں پر لیکر امت کا بوجھ ہلکا کیا اور اس دینی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے پوری امت کی طرف سے اپنے کو محبوس کرر کھاہے گویا یہ ذمہ داراں مدارس تمام مسلمانوں کی طرف سے اجتماعی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے محبوس ہیں، لہٰذا شرعی اور عام اخلاقی ضابطہ کے مطابق ان اداروں کی ضروریات کو پورا کرنا تو امت پر لازم ہے ہی، خود ان ذمہ داراں کی کفالت کرنا بھی اجتماعی ذمہ داری ہے کیونکہ جو شخص دوسرے کے کام میں محبوس ہو تو اس کا نان ونفقہ اور ضروری خرچہ اس شخص کے ذمہ ہے جس کے کام میں یہ لگا ہوا ہو، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان اداروں کے

---

[1] صحيح مسلم، باب استحباب الوضع من الدين.

نمائندگان کو چندہ مانگنے کی نوبت ہی نہ آنے دیں بلکہ از خود ہی اقدام کرکے تعاون کرتے رہے اور اس کو اپنی دنیوی اور اخروی سعادت بلکہ ذمہ داری سمجھیں۔

چندہ کرنے سے متعلق چند کوتاہیاں

چندہ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ چندہ کرنے میں شرعی احکام کا بھرپور لحاظ رکھیں اور اس میں کسی ناجائز امر کا ہرگز ارتکاب نہ کریں، عمومی طور پر چندہ کرنے میں جو کچھ کوتاہیاں برتی جاتی ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق:

الف: یا تو چندہ کرنے والے سے ہوتا ہے کہ چندہ کرنے کے لئے کوئی ایسی صورت اختیار کی جاتی ہے جس میں دینے والے کی دلی رضامندی برقرار نہیں رہ پاتی اور وہ کسی دباؤ یا محض شرماشرمی کی وجہ سے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ب: چندہ کرنے میں غیر ضروری مبالغہ آرائی بلکہ غلط بیانی تک سے کام لیا جاتا ہے۔

ج: کوئی ایسی صورت اختیار کی جاتی ہے جس سے علماء، مدارس یا دین دار طبقہ سے لوگوں کی بداعتمادی اور ان کی ایک گونا حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔

د: حاصل ہونے والے رقوم کو شرعی ضوابط کے ساتھ خرچ نہیں کیا جاتا۔

حالانکہ شریعت کی روشنی میں یہ باتیں شرعاً منکرات میں شامل ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ نے جس طریقہ سے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دیکر دینی ضرورت کی تکمیل فرماتے تھے اس میں ان منکرات کا نام و نشان تک دیکھنے کو نہیں ملتا۔

چندہ کرنے کے اصول وضوابط

لہٰذا چندہ کروانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان منکرات سے بچتے ہوئے چندہ کریں، جس کا آسان اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ مجمع عام میں مدرسہ کی ضرورت کو

اجمال یا تفصیل کے ساتھ بیان کر کے چندہ کرنے کی اپیل کی جائے اور درج ذیل باتوں کی بھرپور رعایت رکھی جائے کہ:

۱۔ کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس سے مخاطب دباؤ یا شرم کے مارے کچھ دیدے، کہ مثلاً اہل محلہ / گاؤں پر فی کس یا فی گھر کچھ رقم مقرر کر لی جائے جو وہ ہر حال میں دے گا، بار بار اصرار کیا جائے، یا لوگوں کے ہوتے ہوئے انفرادی طور پر ہر ایک سے چندہ مانگا جائے، البتہ اگر کوئی شخص بہت ہی بے تکلف ہو اور یقین ہو کہ میرے مانگنے کی وجہ سے وہ دینے پر مجبور نہیں ہو تا بلکہ دلی مرضی نہ ہونے کی صورت میں وہ آزادی کے ساتھ انکار یا معذرت کرے گا تو ایسے شخص سے خطاب خاص کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اتنی صفائی وسادگی اور بے تکلفی بہت کم جگہ ہوتی ہے۔

"ہدیہ علائیہ" میں ہے؛

لا يحلُّ للسّائل أن يأخذ مِن أحد مــالا إلّا عــنٌ طيــبِ نفــس، فلــو طلب مِن إنسان مالا علىٰ ملأ مِن النّاس ودفع له حياء لا يحلّ له.[1]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرص واصرار کے ساتھ جو مال حاصل کر لیا جائے اس میں برکت نہیں ہوتی، چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنما أنا خازن، فمن أعطيته عن طيب نفس، فيبــارك لــه فيــه، ومــن أعطيته عن مسألة وشره، كان كالذي يأكل ولا يشبع.[2]

---

[1] الهدية العلائية،ص٢٣٣.

[2] صحيح مسلم،باب النهي عن المسألة.

ذاتی چندے کی نوعیت اگر چہ مدرسہ وغیرہ دینی کاموں کے چندہ سے مختلف ہوتی ہے اور یہ حدیث اصلاً ذاتی چندے سے متعلق ہے، تاہم اگر دینی امور کے چندہ میں بھی دینی احکام ومسائل کی رعایت نہ رکھی جائے کہ مثلاً مخاطب کو کسی طریقہ سے مجبور کیا جائے تو ایسی صورتوں کا حدیث کے عموم میں داخل ہونا اور بے برکتی کا سبب بننا کچھ بعید نہیں۔

۲۔ مدرسہ کی ضرورت بیان کرنے میں مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے مکمل گریز کر لیا جائے۔ "ہدیہ علائیہ" میں ہے؛

مَن أخذ مِن النّاس مالا علی صفة أنّه محتاج أو صالح أو عالم أو شريف وهو ليس كذلك فما أخذه حرام.[1]

۳۔ چندہ جمع کرنے کے لئے کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جس سے علماء یا دینی مدارس کی بدنامی اور اس سے لوگوں کی بد اعتمادی پیدا ہونے کا خدشہ ہو، چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ یہ بد اعتمادی رفتہ رفتہ جڑ پکڑتی ہے اور انجام کار نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایسے افراد اہل علم اور بزرگان دین کی صحبت سے محروم ہو جاتے ہیں اور یوں وہ بیش بہا منکرات اور نت نئے فتنوں کے شکار ہو جاتے ہیں، یہی بد اعتمادی معاشرے کے بہت سے افراد کے لئے دینی راستہ پر آنے یا اس پر بر قرار رہنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

۴۔ چندہ لیتے وقت دینے والے سے وضاحت کرائی جائے کہ واجب صدقہ ہے یا نفلی؟ اور کسی خاص مد میں دینا چاہتا ہے یا مدرسہ کے عمومی مصالح کے لئے؟ اور پھر دینے والے کی وضاحت کے مطابق اس رقم کو خرچ کرنے کا بھی اہتمام کریں۔

---

[1] الهدية العلائية، ص٢٣٣.

۵۔مال حرام میں سے چندہ نہ لیاجائے، لہٰذا جس شخص کی پوری یا اکثر آمدنی حرام کی ہو، اس سے چندہ وصول نہ کیاجائے، فقہی لحاظ سے بعض صورتوں میں اگرچہ اس کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود ایسے مال میں چونکہ شرعاً خباثت ہوتی ہے، اس خباثت کی وجہ سے ایسامال دینی مدارس اور اس کے معزز طلبہ کے شایان شان نہیں ہے، نیز جس مال کے کمانے اور حاصل کرنے کا طریقہ کار شریعت سے متصادم ہو اس میں بے برکتی ہوتی ہے جس کا کچھ نہ کچھ اثر استعمال کرنے والوں کے خون وپوست میں بھی سرایت کرتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے جذبات واخلاق متوازن نہیں ہوتے ،جبکہ دینی مدارس کے طلبہ کے اہداف میں سے یہ بھی ہے کہ ایک مثالی عالم دین بن کر دین کی خدمت انجام دیتارہے۔

اس لئے اکابر اہلِ علم کا یہ معمول رہاہے کہ جن افراد کے متعلق یقین یا ظن غالب ہو کہ آمدنی حرام ہے ان سے چندہ وصول کرتے ہیں نہ ہی ان کی دعوت منظور کرتے ہیں، البتہ اگر ایسا شخص حلال میں سے کچھ دینے یا دعوت کرنے کا انتظام کرے تو اس کے لینے اور قبول کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

قال تاج الشريعة: أما لو أنفق في ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره لأن الله تعالیٰ لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بما لا يقبله. اهـ. شرنبلالية.[1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين،باب ما يفسد الصلاة، وما ويكره فيها،ج١ص ٦٥٨.

لا يكسب عبد مالا من حرام، فينفق منه فيبارك له فيه، ولا يتصدق به فيقبل منه، ولا يترك خلف ظهره إلا كـان زاده إلى النـار، إن الله عز وجل لا يمحو السيئ بالسيئ، ولكن يمحو السيئ بالحسن، إن الخبيث لا يمحو الخبيث".[١]

حکومت اور ذی وجاہت افراد سے چندہ لینے کا حکم

چندہ جس طرح عام افراد سے وصول کرنا جائز ہے یوں ہی ذی وجاہت اشخاص یا حکومت سے بھی تعاون وصول کرنے میں بذات خود مضائقہ نہیں ہے تاہم اس بات کا اطمینان کرنا ضروری ہے کہ اس تعاون کی وجہ سے اس شخص یا حکومت کو مدرسہ کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہ ملے اور اس کی بنیاد پر وہ مستقبل میں مدرسہ کو اپنے کسی مرضی پوری کرنے پر مجبور نہ کرے، اور تجربہ شاہد ہے کہ حکومت اور جو لوگ اپنے اصل کے لحاظ سے دین دار نہ ہوں، ان کا تعاون اکثر مستقبل کے کسی منصوبہ بندی کا مقدمہ ثابت ہوتا ہے اور تعاون ہی کے راستہ سے وہ مدرسہ کے داخلی امور میں اثر انداز ہو جاتے ہیں، اس لئے جہاں کہیں ایسا خدشہ ہو توان افراد سے چندہ کرنے سے احتراز کرلینا چاہئے کہ ایک تو اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اس چندہ میں برکت نہیں ہوتی اور ساتھ ایسا چندہ قبول کرنا مدرسہ کے مصالح میں فائدہ مند بھی نہیں ہے۔

چندہ جمع کرنے کے لئے سفیر مقرر کرنا

بعض مدارس میں چندہ اکھٹا کرنے کے لئے یہ بھی ایک سلسلہ رکھا جاتا ہے کہ مختلف علاقوں کے لئے سفیر مقرر کئے جاتے ہیں اور جو کچھ چندہ وہ جمع کرتے ہیں اسی میں

---

[١] مسند أحمد ط الرسالة، رقم الحديث: ٣٦٧٢، ج٦ص ١٨٩.

سے کچھ فیصد تنخواہ مقرر کیاجاتا ہے کہ مثلاً جو چندہ وہ جمع کرے گا اس کا پانچ فیصد، دس فیصد رقم سفیر بطور تنخواہ لے لے گا،اس طریق کار میں عملی کوتاہیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے علاوہ فقہی لحاظ سے بھی یہ اشکال ہوتا ہے کہ اجیر کے عمل سے جو کچھ حاصل ہو گا،اسی کو اجرت ٹھہرایا گیا جو کہ قفیزِ طحان کے تحت داخل ہے،اس لئے یہ طریقہ کار اپنانا درست نہیں ہے اور چونکہ ایسے سفیر لوگ ملنا مشکل ہے جو اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ یہ کام کریں اور اس میں شرعی حدود کا بھی عہد وپاس رکھیں چنانچہ عموماً ایسے لوگ دانستہ یا نادانستہ چندہ جمع کرنے میں بہت سی کوتاہیوں کے شکار ہو جاتے ہیں اس لئے اکابر اہلِ علم میں اس سلسلہ کا رواج نہ تھا۔

سفارت کے کام کا حکم

جو کام خود کرنا جائز ہوتا ہے وہ کسی سے کروانا بھی درست ہوتا ہے،لہٰذا جس طرح خود چندہ کرنا جائز بلکہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ ہو تو موجبِ ثواب کام ہے یوں ہی اس کے لئے کوئی نائب و سفیر بھی مقرر ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعے بھی چندہ کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے۔ البتہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ عام طور پر جو لوگ اجرت کے بدلے سفارت کا کام کرتے ہیں،ان سے چندہ کے شرعی حدود واحکام کی پابندی کرنے کی توقع رکھنی مشکل ہے،اس لئے اس میں خاصے احتیاط کی ضرورت ہے۔ایسا نہ ہو کہ نااہل اور غیر محتاط شخص کو یہ ذمہ داری سونپ دی جائے اور ان کے حرکات وسکنات سے لوگوں کے دل میں دین،اہل دین یا دین کے اداروں کی تنقیص و کمزوری کا پہلو پیدا ہو جائے۔

اجرت کے ساتھ سفیر مقرر کرنے میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی محنت اور اجرت دونوں باتیں باہمی اتفاق سے پہلے طے کر لئے جائیں کہ وہ تحصیل چندہ میں کتنا

وقت گزارے گا؟ کام کی نوعیت کیا ہوگی؟ اور اس کی اجرت کتنی ہوگی؟ اگر کام کی نوعیت معلوم نہ ہو یا اجرت متعین نہ ہو تو دونوں صورتوں میں معاملہ فاسد ہو جائے گا جو موجبِ گناہ ہے۔

مہتمم کے پاس چندہ اور دیگر رقوم کی فقہی تکییف

مہتمم اور متولی کی حیثیت امین کی ہوتی ہے اس کے پاس مدرسہ کی جو کچھ رقم جمع ہو جائے وہ فقہی لحاظ سے امانت ہوتی ہے اور امانت بھی کسی ایک شخص یا فرد کی نہیں ہے جس میں اگر کوتاہی ہو بھی جائے تو بھی چھٹکارا پانا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتا بلکہ مالک سے معاف کروانا کافی ہے بلکہ بہت سے طلبہ کی امانت ہے جس میں اکثر نابالغ بھی ہوتے ہیں جن کی اجازت ورضامندی کا بھی اس باب میں اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا اربابِ اہتمام کی ذمہ داری ہے کہ ان رقوم کو عام امانت سے بھی زیادہ حفاظت واحتیاط کے ساتھ رکھنے کی پابندی کریں، اگر کماحقّہ حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے مال ضائع ہو جائے تو اس کا ضمان لازم ہے، البتہ اگر اچھی طرح حفاظت کرنے اور کسی کوتاہی کے بغیر ہی مال ضائع ہو جائے تو امانت ہونے کے ناطے مہتمم پر اس کا ضمان شرعاً لازم نہیں ہے۔

البتہ چونکہ مال کا ضیاع کسی نہ کسی کوتاہی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے اور عام امانت کے بجائے یہاں احتیاط کی مزید ضرورت پڑتی ہے اس لئے کئی بزرگانِ دین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ ایسی صورت حال میں بہر حال مدرسہ کو ضمان دینے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا منیر احمد صاحب رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے ایک دن مدرسہ کی روئیداد چھپوانے کے لئے دہلی گئے راستہ میں ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ گم ہوگئے، مدرسہ کے سب اراکین نے کہا کہ چونکہ امانت تھی اس لئے مدرسہ تاوان نہیں لے سکتا، مولوی صاحب نے کہا کہ میں دوں گا، اس میں مولوی صاحب اور اراکین کا

اختلاف ہوا، آخر فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو لکھا جائے وہ فیصلہ کریں، اس پر عمل کیا جائے، چنانچہ لکھا گیا مولانا نے یہ جواب تحریر فرمایا کہ مولوی صاحب پر ضمان نہیں ہے، مولوی محمد منیر صاحب اس پر بہت متغیر ہوئے اور کہا کہ مولانا محمد رشید احمد صاحب نے یہ ساری فقہ میرے ہی واسطے پڑھی تھی، میں تو تب جانوں کہ اگر یہ روپیہ ان سے ضائع ہو جاتا تو اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیں کہ وہ کیا کرتے؟ مدرسہ میں داخل کرتے یا نہ کرتے؟ یقیناً کرتے۔[1]

مہتمم کے مال وصول کرنے کی فقہی تکییف

مہتمم چندہ دہندگان سے جو رقم وصول کرتا ہے، اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا مہتمم چندہ دینے والوں کی طرف سے وکیل ہے یا مدرسہ کے طلبہ کی طرف سے؟ اس بات کے تصفیہ کرنے پر مدارس سے متعلق بعض اہم مسائل موقوف ہیں، مثلاً:

الف: مہتمم کے قبض کرنے سے رقم دینے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

ب: اگر سال بھر یہ رقم مہتمم کے پاس موجود رہی تو کیا دینے والوں پر اس کی زکوۃ لازم ہو گی یا نہیں؟

ج: کیا چندہ دہندگان کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے چندہ کو واپس لے لیں؟

د: کیا دینے والوں کی زکوۃ کی ادائیگی میں یہ لازم ہے کہ مہتمم طلبہ یا دوسرے فقراء سے تملیک کروانے کے بعد ہی یہ رقم استعمال کریں یا اس کی ضرورت نہیں ہے؟

یہ اور اس نوعیت کے بعض دیگر مسائل اسی فقہی تکییف پر مبنی ہے کہ مہتمم صاحب جو رقم وصول کرتا ہے وہ اس میں کس کی طرف سے وکیل ہے؟ چندہ دہندگان

---

[1] تحفة العلماء، ج۱ص۲۸۹.

کی طرف سے یا طلبہ کی طرف سے؟ اور دونوں ہی صورتوں میں کچھ مشکلات عائد ہوتی ہیں، پہلی صورت میں عملی اور دوسری طرف سے علمی وفقہی اشکالات ہیں، اس لئے ابتداءً اکثر اہل علم کی رائے یہ تھی کہ مہتمم چندہ دینے والے کی طرف سے ہی وکیل ہے لیکن بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہا اللہ کی تحقیق فرمانے کے بعد اب اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے اور اس کے وصول کرتے ہی رقم دینے والوں کی زکوۃ ادا ہو جائے گی، لہٰذا اس کے بعد طلبہ یا دیگر فقراء سے الگ تملیک کروانے کی ضرورت نہیں، البتہ اس کے بعد بھی مہتمم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اموال زکوۃ کو اپنے صحیح مصارف میں استعمال کریں۔

جن اہلِ علم کے نزدیک مہتمم محض چندہ دہندگان کی طرف سے وکیل ہے، ان کے نزدیک ان رقوم کی زکوۃ تب ہی ادا ہوگی جبکہ فقیر طلبہ کو یہ رقم بطور تملیک دی جائے، چنانچہ وہ اسی مقصد کے لئے حیلہ تملیک کا طریقہ کار اپناتے ہیں، تملیک کے طریقہ کار میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ دیتے وقت واقعۃً تملیک کروائی جائے کہ طلبہ کو مالک بنا کر رقم دی جائے اور اس کے بعد وہ طلبہ اپنی دلی رضامندی کے ساتھ ہی وہ رقم مدرسہ میں جمع کریں، کسی دباؤ یا شرما شرمی میں دینے پر مجبور نہ ہوں۔

اس کی مبنی بر احتیاط صورت وہ ہے جو ہمارے ہاں بعض مدارس میں رائج ہے کہ سال کے شروع میں فی طالب علم کی اخراجات کا حساب لگایا جاتا ہے اور پھر ہر مہینہ تملیک کروانے سے پہلے مستحق زکوۃ طلبہ کو جمع کیا جاتا ہے کہ آپ میں سے ہر شخص پر فی کس اتنا خرچہ ہوتا ہے اور یہ رقم مدرسہ کو دینا ضروری ہے ورنہ مدرسہ اس کے بغیر

تبرّعاً آپ پر خرچہ برداشت نہیں کرے گا، آگے آپ کو اختیار ہے کہ یہی رقم واپس مدرسہ میں دیدیں یاگھر سے لا کر جمع کر دیں۔

چندہ مدرسہ میں خرچ کرنے کا طریقہ کار

ذمہ دارانِ مدرسہ کے ہاتھ میں مدرسہ کے مال کی حیثیت امانت کی ہوتی ہے اور امانت کی کماحقہ حفاظت کرنا اور اس میں ہر طرح کی کوتاہی وخیانت سے بچنا امین کے ذمہ تو لازم ہے ہی، لیکن عام امانت کے مقابلہ میں مدرسہ کے مال میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو ان جیسے اموال کو عام امانات سے کہیں زیادہ نزاکت اور باعث اہتمام وحفاظت بنادیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مدرسہ کے خزانہ میں جو کچھ اموال نقدیااجناس کی شکل میں جمع ہوتے ہیں وہ کسی خاص فرد / قوم یاچند افراد کی امانت نہیں ہے جس پر کوتاہی کی صورت میں ان سے معافی تلافی کروائی جائے اور نہ مانے توان کی منت سماجت کی جائے، بلکہ یہاں تو دینے والے لوگ بھی بے شمار ہے اور جن افراد کے نام پر یہ رقم جمع ہوتی ہے ان کا بھی کوئی شمار نہیں ہے کیونکہ رقم ملتی ہے طلبہ کرام کے عنوان سے اور ظاہر ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، مزید یہ بھی ہے کہ جس جذبہ اور جن مقاصد واہداف کی خاطر مدرسہ میں رقم جمع ہوتی ہے وہ بھی کوئی دنیوی یامعمولی چیز نہیں ہے بلکہ خدمت دین کے مقدس اور عظیم ومبارک جذبہ کے تحت ہی لوگ مال دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

ان مختلف پہلوؤں کی وجہ سے مدرسہ کے اموال کی اہمیت عام امانت کی بنسبت کہیں زیادہ ہو جاتی ہے، ان وجوہات کی وجہ سے اس قسم کے اموال مال غنیمت کی طرح ہو جاتے ہیں جن میں خیانت کرنے کی بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں بلکہ مدرسے کا مال غنیمت کے مال سے اس لحاظ سے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت حاصل کرنے کا بنیادی مقصد خدمت دین نہیں ہے جبکہ مدرسہ میں مال دیاہی اسی جذبہ سے ہے کہ اس سے دین

اور طلبائے دین کی خدمت ہوتی رہے، لہٰذا مال غنیمت کے متعلق جو کچھ وعیدیں احادیث مبارکہ میں وارد ہیں، ان کے عموم میں مدارس ومساجد کے اموال بطریقہ اولیٰ داخل ہیں۔

مدارس میں مالی احتیاط کے متعلق چند احادیث

بخاری شریف کی یہ روایت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ:

إن رجالا يتخوضون في مال الله بغير حق، فلهم النار يوم القيامة.[1]

"اللہ کے مال" سے زکوۃ، خراج، بیت المال وغیرہ وہ تمام اموال مراد ہیں جو کسی خاص شخص کا حق نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کی عمومی مصلحت کے لئے مختص ہوتے ہیں، اس میں مدارس کے اموال بھی داخل ہیں کہ وہ کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہوتے، نیز اس لئے بھی کہ وہ خاص دین خدا کی حفاظت وخدمت کے نام پر ہی لی دی جاتی ہیں، "بغیر حق" کا معنی یہ ہے کہ شرعی استحقاق کے بغیر یا واقعی استحقاق سے زیادہ مال استعمال کرے۔

علامہ مظہری رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

أي: يَشْرَعون في الغنيمة والفيء والزكاة ويتصرَّفون فيها بغير أمر الله ورسوله، "فلهم النار".[2]

علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ مال غنیمت میں خیانت کرنے کا حکم لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، باب قول الله تعالى: {فأن لله خمسه وللرسول}، رقم الحديث: ٣١١٨.

[2] المفاتيح في شرح المصابيح، باب قِسْمَةِ الغنائمِ والغُلولِ فيها، ج٤ص٤٣٢.

فهذا ما في الغلول وقد يدخل فيه منع الزكوات لأنها من حقوق المسلمين أيضا بالمعنىٰ والله أعلم.[١]

یہاں استحضار وسہولت کے پیش نظر علامہ منذری رحمہ اللہ کی کتاب "الترغیب والترہیب" سے چند روایات اس جذبہ کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں کہ پہلے کی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ان جیسے اموال کی اہمیت اور معاملہ کی نزاکت دل میں راسخ ہو جائے اور مال وقف کو مزید احتیاط و چھان بین کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

"بخاری" میں ہے:

عن عبد الله بن عمرو بن العاصي رضي الله عنهما قال كان على ثقل رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم رجل يقال له كركرة فمات فقال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم هو في النار فذهبوا ينظرون إليه فوجدوا عباءة قد غلها.[٢]

ترجمہ: کر کرۃ نامی ایک شخص حضور ﷺ کی سامان کی حفاظت پر مقرر تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آگ (یعنی جہنم) میں ہے، (یہ سن کر)صحابہ کرام اس کی طرف دیکھتے رہیں تو ایک زرہ دیکھا جو کہ اس نے مال غنیمت میں سے چھپایا تھا۔"

"المعجم الاوسط" میں ہے:

عن حبيب بن مسلمة رضي الله عنه قال سمعت أبا ذر يقول قال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم إن لم تغل أمتي لم يقم لهم عدو أبدا.

---

[١] التمهيد ،ج٢ص ١١.

[٢] كتاب الجهاد والسير، بَابُ القَلِيلِ مِنَ الغُلُولِ،ج٤،ص٧٤.

قال أبو ذر لحبيب بن مسلمة هل يثبت لكم العدو حلب شاة قال نعم وثلاث شياه غزر قال أبو ذر غللتم ورب الكعبة.[1]

ترجمہ:"اگر میری امت خیانت نہ کرتی تو اس کے مقابلہ میں دشمن کبھی نہ ٹھہرتا، حدیث کے راوی حضرت ابوذر نے حبیب بن مسلمہ سے پوچھا کہ تمہارے مقابلہ میں دشمن بکری کو دوہنے کی مقدار ٹھہرتا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں بلکہ تین بکریوں کے دوہنے کے بقدر بھی ٹھہرتا ہے جو زیادہ دودھ دیتی ہیں، حضرت ابوذر نے فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم: تم خیانت کے مرتکب ہوں۔"

"صحیح مسلم" میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم فذكر الغلول فعظمه وعظم أمره حتى قال لا ألفين أحدكم يجيء يوم القيامة على رقبته بعير له رغاء فيقول يا رسول الله أغثني فأقول لا أملك لك شيئا قد أبلغتك لا ألفين أحدكم يجيء يوم القيامة على رقبته فرس له حمحمة فيقول يا رسول الله أغثني فأقول لا أملك لك شيئا قد أبلغتك.[2]

ترجمہ:"حضور ﷺ ایک دن کھڑے ہوئے اور خیانت کا ذکر کیا تو بڑے اہمیت کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا یہاں تک کہ فرمایا کہ میں تم میں کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن اپنے گردن پر اونٹ اٹھا کر لا رہا ہو جبکہ وہ اونٹ آوازیں نکالتا ہو، پھر یہ شخص مجھ سے کہے کہ اللہ کے رسول: میری مدد کرو اور میں جواب میں کہوں کہ

---

[1] باب الميم، إن لم تغل أمتي لم يقم لهم عدو أبدا، ج٨،ص١٠٥.

[2] كتاب الإمارة،باب غلظ تحريم الغلول، ج٣،ص١٤٦١.

میرے اختیار میں آپ کے لئے کچھ نہیں ہے، میں تو (شریعت کا حکم) پہنچا چکا تھا، (کہ خیانت حرام اور وبال جان ہے) میں تم میں کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن اپنی گردن پر گھوڑا سوار کر کے لا رہا ہو جبکہ گھوڑا اپنی آوازیں بھی نکالتا ہو اور پھر یہ کہے کہ اللہ کے رسول: میری مدد کرو اور میں جواب میں کہوں کہ میرے اختیار میں آپ کے لئے کچھ نہیں ہے، میں تو (شریعت کا حکم) پہنچا چکا تھا۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال خرجنا مع رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم إلىٰ خيبر ففتح الله علينا فلم نغنم ذهبا ولا ورقا غنمنا المتاع والطعام والثياب ثم انطلقنا إلىٰ الوادي يعني وادي القرىٰ ومع رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم عبد له وهبه له رجل من جذام .. فلما نزلنا الوادي قام عبد رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم يحل رحله فرمي بسهم فكان فيه حتفه فقلنا هنيئا له الشهادة يا رسول الله. قال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم كلا والذي نفس محمد بيده إن الشملة لتلتهب عليه نارا أخذها من الغنائم لم تصبها المقاسم قال ففزع الناس فجاء رجل بشراك أو شراكين فقال أصبت يوم خيبر فقال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم شراك من نار أو شراكان من نار.[١] رواه البخاري ومسلم وأبو داود والنسائي.

---

[١] كتاب الإيمان،باب غلظ تحريم الغلول، وأنه لا يدخل الجنة إلا المؤمنون،ج١،ص١٠٨.

ترجمہ: "ہم حضور ﷺ کے ساتھ خیبر کی طرف نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح دیدی لیکن ہم نے سونا، چاندی غنیمت میں حاصل نہیں کیا بلکہ کچھ سامان، کھانے کی چیزیں اور کچھ کپڑیں غنیمت میں ملے، پھر ہم ایک وادی کی طرف چلے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غلام میں بھی تھا جو قبیلہ جذام کے ایک آدمی نے ان کو ہبہ کے طور پر دیا تھا، جب ہم وادی میں اتر گئے تو حضور ﷺ کا غلام آپ کا کجاوہ کھولنے کے لئے اٹھا اور اٹھتے ہی تیر لگا جس کی وجہ سے موت واقع ہو گئی، تو ہم نے کہا کہ اس کو شہادت مبارک ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر گز نہیں، خدا کی قسم: وہ چادر اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے جو اس نے غنیمت کے مال میں سے اس وقت اٹھایا تھا جبکہ غنیمت تقسیم نہیں ہوئی تھی، حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ لوگ بڑے ڈر گئے ،ایک آدمی ایک یا دو تسمے لیکر آیا اور کہا کہ یہ میں نے خیبر کے دن لئے تھے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آگ کا تسمہ ہے یا فرمایا کہ آگ کے دو تسمے ہیں۔"

"سنن نسائی" میں حضرت ابی رافعؓ سے روایت ہے:

عن أبي رافع رضي الله عنه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا صلى العصر ذهب إلى بني عبد الأشهل فيتحدث عندهم حتى ينحدر للمغرب قال أبو رافع فبينا النبي صلى الله عليه وسلم يسرع إلى المغرب مررنا بالبقيع فقال أف لك أف لك أف لك قال فكبر ذلك في ذرعي فاستأخرت وظننت أنه يريدني فقال ما لك امش قلت وحدث حدث فقال ما ذاك قلت أففت بي قال لا ولكن هذا فلان بعثته ساعيا على بني فلان فغل نمرة فدرع مثلها من نار.[١]

---

[١] كتاب الإمامة، الْإِسْرَاعُ إِلَى الصَّلَاةِ مِنْ غَيْرِ سَعْيٍ، ج٢،ص١١٥.

ترجمہ:"حضرت ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب عصر کی نماز پڑھتے تو بنی عبد الاشہل کے ہاں تشریف لے جاتے اور ان کے ساتھ مغرب تک بات چیت کرتے تھے، راوی کہتے ہے کہ ایک بار، جبکہ حضور ﷺ مغرب کے لئے جلدی جلدی تشریف لارہے تھے اور ہم بقیع سے گزرے، حضور ﷺ نے فرمایا:"افسوس ہے آپ پر، افسوس ہے آپ پر، افسوس ہے آپ پر"میرے دل میں یہ بات بڑی گراں گزری اس لئے میں تھوڑا پیچھے ہو گیا کیونکہ میرا گمان تھا کہ حضور ﷺ مجھ سے یہ بات فرمارہے ہیں، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا؟ چلو، میں نے عرض کیا کہ کوئی حادثہ پیش آیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا؟ میں نے کہا کہ آپ نے مجھ پر اظہار افسوس فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں (آپ پر نہیں) بلکہ یہ (تو) فلاں شخص (کے متعلق کہا جس) کو میں نے فلاں قبیلہ پر گورنر بنا کر بھیجا تو اس نے ایک سفید وسیاہ دھاری دار چادر خیانت کر کے حاصل کی تو اس کو اس جیسی آگ کی چادر پہنائی گئی۔"

عن أبي حازم رضي الله عنه قال أتي النبي صلى الله عليه وسلم بنطع من الغنيمة فقيل يا رسول الله هذا لك تستظل به من الشمس قال أتحبون أن يستظل نبيكم بظل من نار. رواه أبو داود في مراسيله.

ترجمہ: حضور ﷺ کے پاس مال غنیمت میں سے کچھ کھال لائی گئی کہ (قبول کر لیجئے) یہ آپ کے لئے دھوپ سے بچنے کا کام دے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہیں پسند ہے کہ تمہارا نبی آگ کے سایہ میں پناہ لے؟"

عن سمرة بن جندب رضي الله عنه قال أما بعد فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من يكتم غالا فإنه مثله. رواه أبو داود.[١]

ترجمہ: حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص خیانت کرنے والے کو چھپائے گا وہ بھی اس کی طرح ہو گا۔"

خرچ کرنے کا طریقہ کار

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ مدرسہ ہو یا دیگر اوقاف، اس کے نام چندہ وغیرہ کے ذریعے جو مال جمع ہو جاتا ہے، اس کو پورے احتیاط کے ساتھ شرعی تقاضوں کے مطابق خرچ کرنے کا اہتمام ضروری ہے اور مدرسہ کے اندر مالیات کا نظام نہایت صاف وشفاف ہونا چاہئے، اس میں بے احتیاطی اور غفلت سے کام لینا کسی طرح جائز نہیں، البتہ عملی طور پر اس کا نظم کیا ہونا چاہئے؟ مدرسہ کے اندر مالیات کے آمدن وصرف اور محاسبی کا نظم وضبط کس طرح تشکیل دیا جائے؟ یہ انتظامی نوعیت کا مسئلہ ہے جو وقت وماحول، مدرسہ کے حجم اور آمد وصرف کے کم زیادہ ہونے سے مختلف بھی ہو سکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام لازم ہے:

الف: مالیات کا نظم نہایت صاف وشفاف ہو اور دیانت دار افراد کے ہاتھ میں ہو کہ جہاں کسی خرد برد کا اندیشہ نہ ہو۔

ب: جو رقم یا اجناس مدرسہ کے کسی مخصوص کام میں استعمال کرنے کے لئے دئے جاتے ہیں کہ مثلاً چندہ جمع کرنے والا اسی خاص مصرف کا تقاضا رکھ کر چندہ جمع کرے یا دینے والا

---

[١] ١ الترغيب والترهيب للمنذري، كتاب الجهاد،الترهيب من الغلول والتشديد فيه وما جاء فيمن ستر على غال،ج٢ص ٢٠٠.

دیتے وقت وضاحت کرے، تو ایسی چیز اسی خاص مصرف میں خرچ کرنی ضروری ہے اس کے علاوہ دیگر امور میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، مثلاً جو رقم مدرسہ کے عمارت کی مد میں دی جائے، وہ تنخواہوں یا عمارت کے علاوہ دیگر امور میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

رجل قال جعلت حجرتي هذه لدهن سراج المسجد ولم يزد على ذلك قال الفقيه أبو جعفر رحمه الله تعالى تصير الحجرة وقفاً على المسجد إذا سلمها إلى المتولي وعليه الفتوىٰ وليس للمتولي أن يصرف الغلة إلى غير الدهن.[1]

علامہ طرابلسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

رجل قال جعلت حجرتي هذه لدهن سراج المسجد ولم يزد عليه قال الفقيه أبو جعفر رحمه الله تصير الحجرة وقفا عليه إذا سلمها إلى المتولي وعليه الفتوىٰ وليس له أن يصرفها في غير الدهن.[2]

ج: جو مال / جنس کسی خاص مصرف کی صراحت کئے بغیر مدرسہ کو دیا جائے، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ صدقات واجبہ: جیسے زکوۃ، عشر، صدقہ فطر، نماز و روزے کا فدیہ، نذر، کفارہ۔

۲۔ صدقات نافلہ: جیسے عام عطیہ و صدقہ۔

اس آخری قسم کے اموال مدرسہ کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر کہیں بھی استعمال کرنا جائز ہے اس میں تملیک بھی ضروری نہیں ہے، جہاں تک صدقات واجبہ کا

---

[1] فتاوى قاضيخان، كتاب الوقف، باب الرجل يجعل داره مسجدا، ج٣ص ١٦٣.

[2] الإسعاف فى أحكام الأوقاف، باب بناء المساجد والربط، ص:٧٥.

مسئلہ ہے تو جیسا کہ پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اہل علم کی آراء مختلف ہیں، جن اہل علم کے نزدیک مہتمم محض چندہ دہندگان کی طرف سے وکیل ہے ان کے نزدیک ان اموال کو قبض کرنے کے بعد کسی مستحق زکوۃ فقیر سے اس کی تملیک کروانا بھی لازم ہے اور جن علماء کے نزدیک مہتمم مستحق طلبہ کی طرف سے وکیل ہے ان کے نزدیک تملیک کا اہتمام کروانا لازم نہیں ہے، البتہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ اموال طلبہ کے براہ راست اخراجات میں ہی صرف کرنا ضروری ہے۔

صدقات واجبہ اور غیر واجبہ کی مدات الگ رکھنا

درج بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ مدرسہ میں جمع ہونے والے اموال کی نوعیت ایک نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں، لہٰذا چندہ لیتے وقت ایک تو اس بات کی وضاحت کروانا ضروری ہے کہ کس مد میں چندہ دیا جارہا ہے؟ اور چندہ کی نوعیت کیا ہے صدقہ واجبہ یا غیر واجبہ؟ اور ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ جمع ہونے والے چندہ کو اس کے واقعی شرعی مصرف میں خرچ کیا جائے۔

اسی بات کے پیشِ نظر یہ بھی ضروری ہے کہ مدرسہ میں خاص مصرف چندہ اور عام چندہ، پھر عام چندہ میں سے صدقہ واجبہ اور نافلہ کے نام سے مختلف مدات رکھے جائیں اور جمع ہونے والے اموال کو متعلقہ مد کے اندر ہی رکھا جائے، ایک مد کے چندہ کو بلاضرورت دوسرے مد میں استعمال کرنا شرعاً درست نہیں ہے کہ مثلاً خاص مصرف والے چندہ میں کچھ مال عمارت کے لئے جمع ہوا اور اب اس کو طلبہ کے کھانے پینے یا ملازمین کی تنخواہوں میں دیا جائے، یا صدقہ واجبہ کے مد میں سے کچھ مال لیکر صدقہ نافلہ کی جگہ استعمال کیا جائے اور اس میں ان باتوں کی رعایت نہ رکھی جائے جس کا لحاظ رکھنا صدقہ واجبہ کے خرچ کرنے میں ضروری ہے۔

ارباب اہتمام کی ذمہ داری ہے کہ ہر مد کو الگ الگ رکھ کر اچھی طرح محفوظ رکھیں اور بلاضرورت ان کو خلط ملط کریں نہ ہی ایک مد سے کچھ مال لیکر دوسری مد میں جمع کریں۔

علامہ غانم بغدادی فرماتے ہیں:

المتولي إذا خلط أموال الأوقاف المختلفة يضمن..ولو خلط المتـولي دراهمه بدراهم الوقف صار ضامنا.[1]

تاہم اگر ہنگامی طور پر کسی مد میں ضرورت پیش آئے اور اس کے لئے ضرورت بالکل موجود نہ ہو یا کچھ رقم تو موجود ہو لیکن ضرورت کے لئے کافی نہ ہو تو ایسی صورت میں ایک مد سے کچھ رقم لیکر دوسرے میں بطور قرض دیدینے کی گنجائش ہے، دوسرے مد میں رقم آنے کے بعد قرض کے بقدر رقم پہلے مد کی طرف واپس لوٹائی جائے، اس کی نظیر یہ ہے کہ بیت المال کے اموال کی چار قسمیں اور ان کی مختلف مصارف ہیں، ان تمام اموال کو جدا جدا رکھنا اور ہر نوع مال کو اپنے متعلقہ مصرف میں خرچ کرنا لازم ہے، تاہم ضرورت کے وقت ایک نوع سے کچھ مال لیکر دوسری نوع میں بطور قرض خرچ کرنے کی گنجائش ہے، "شامی" میں ہے:

(قوله: بيوت المال أربعة) سيأتي في آخر فصل الجزية عن الزيلعـي أن على الإمام أن يجعل لكل نوع بيتا يخصه ولـه أن يسـتقرض مـن أحدها ليصرفه للآخر ويعطي بقدر الحاجة والفقـه والفضـل فـإن قصر كان الله تعالى عليه حسيبا.اهـ. وقال الشرـنبلالي في رسـالته:

---

[1] مجمع الضمانات،باب في الوقف،ج١ص٣٢٤.

ذكروا أنه يجب عليه أن يجعل لكل نوع منها بيتا يخصه، ولا يختلط بعضه ببعض، وأنه إذا احتاج إلى مصرف خزانة وليس فيها ما يفي به يستقرض من خزانة غيرها، ثم إذا حصل للتي استقرض لها مال يرد إلى المستقرض منها.[1]

خاص مد کے لئے رقم دی اور وہ مد نہ رہا

کسی خاص مد کے لئے چندہ جمع ہوا تھا اور اب وہ مصرف باقی نہ رہا یا اس میں مزید رقم خرچ کر دینے کی ضرورت نہ رہی، مثال کے طور پر زید نے رواں سال کی دستار بندی کے لئے کچھ رقم دی تھی لیکن کسی وجہ سے دستار بندی منسوخ ہو گئی یا اس میں صرف کرنے کی ضرورت یا نوبت ہی نہیں آئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس رقم کا کیا حکم ہے؟ اس کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ کیا زید کو واپس لوٹانی ضروری ہے یا کسی دوسرے مصرف میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے؟ اور کیا اس میں زید کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس کا حکم جاننے سے پہلے اس رقم کے لین دین کی فقہی تکییف متعین کرنی ضروری ہے۔[2]

بعض معاصر اہلِ علم اس کو وکالت قرار دیتے ہیں، اگر ان کی اس بات کا لحاظ رکھا جائے اور اس کو پورے معنٰی میں وکالت قرار دیا جائے تو اس کے مطابق یہ رقم زید (چندہ

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين،باب العشر،مطلب في بيان بيوت المال ومصارفها، ج٢ ص٣٣٧.

[2] ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث سوال وہی ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے، اس کی بجائے اگر اگر یہ صورت پیش آجائے کہ کسی وقف ادارے میں چندہ جمع کیا گیا اور پھر وہ ادارہ ہی ختم ہو گیا، تو اس کی بحث یہاں مقصود نہیں ہے، اس کی کچھ تفصیل "امداد الاحکام" ج۳ص۱۸۹ پر مذکور ہے، وہاں مراجعت کی جا سکتی ہے۔

دہندہ) کی ملک شمار ہوگی جس میں اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنے کی اجازت دیدے اور چاہے تو واپس لے کر اپنے کام میں لائے۔ کیونکہ وکالت کی وجہ سے ملکیت منتقل نہیں ہوتی اور وکیل مال کا مالک نہیں بنتا بلکہ وکیل بنانے والے کی ملکیت بدستور برقرار رہتی ہے۔

لیکن بظاہر راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کلی طور پر وکالت نہیں ہے بلکہ زید کا مدرسہ یا مسجد میں رقم دینا ہبہ یا صدقہ ہے جس سے مسجد و مدرسہ اس مال کے مالک بن جائیں گے اور دینے والے کی ملکیت ختم ہو جائے گی۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہیں کہ اس طرح اگر کوئی شخص مسجد (مدرسہ بھی اسی حکم میں ہے) کے لئے کوئی چیز دیدے تو مسجد اس کا مالک بن جائے گا اوراس طرح مسجد کے لئے ملکیت ثابت ہو سکتی ہے۔ اور جب یہ رقم مسجد و مدرسہ کی ملکیت بن گئی تو اس کے دوسرے مصارف و مصالح میں بھی خرچ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے البتہ جہاں تک ہو سکے چندہ دہندہ سے اس بات کی اجازت لینا مناسب ہے۔

"فتاویٰ ہندیہ" میں ہے:

رجل أعطىٰ درهما في عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو مصالح المسجد صح؛ لأنه وإن كان لا يمكن تصحيحه تمليكا بالهبة للمسجد فإثبات الملك للمسجد علىٰ هذا الوجه صحيح فيتم بالقبض، كذا في الواقعات الحسامية.[1]

"محیط برہانی" میں ہے:

---

[1] الفتاوى الهندية،الباب الحادي عشر في المسجد،ج٢ص٤٦٠.

وفي «مجموع النوازل» : سئل شيخ الإسلام أبو الحسن عن رجل قال: وقفت داري على مسجد كذا، ولم يزد على هذا وسلمها إلى المتولي صح، ولم يشترط التأبيد ولم يجعل آخره للفقراء، قال: وهذا يكون تمليكاً للمسجد وهبة، فيتم بالقبض وإثبات الملك للمسجد على هذا الوجه يصح، فإن المتولي إذا اشترى من غلة دار المسجد يصح، وكذا من أعطى دراهم في عمارة المسجد ونفقة المسجد أو مصالح المسجد يصح، وكذا إذا اشترى المتولي عبداً لخدمة المسجد يصح كل ذلك، فيصح هذا بطريق التمليك بالهبة، وإن كان لا يصح بطريق الوقف.[١]

"خیر الفتاویٰ" میں درج شدہ ایک فتویٰ بھی اسی کے موافق ہے، چنانچہ وہاں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایک عورت نے مسجد کی تعمیر کے لئے کچھ رقم دیدی، متولی نے رقم قبض کرلی لیکن ابھی تک مکمل طور پر صرف کرنے کی نوبت نہیں آئی اور دینے والی عورت واپس لینے کا تقاضا کرتی ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا یہ جواب دیا گیا:

"صورتِ مسئولہ میں شرعاً مذکورہ رقم واپس لینا جائز نہیں کیونکہ تعمیر مسجد میں رقم دینا تصدق علی المسجد ہے اور صدقہ میں رجوع جائز نہیں۔ ہدایہ میں ہے:"لا رجوع في الصّدقه لأنّ المقصود هو الثّواب وقد حصل."۔مسجد کی انتظامیہ مذکورہ رقم

---

[١] المحيط البرهاني في الفقه النعماني، الفصل الحادي والعشرون: في المساجد، ج٦ص٢١٣.

صرف تعمیر پر خرچ کر سکتی ہے کیونکہ معطی (واقف) کی شرائط کالحاظ رکھنا شرعاً ضروری ہے۔۔دوسرے مصرف پر خرچ کرناموجب ضمان ہو گا۔"[۱]

اس فتویٰ سے درج بالا موقف کی تائید ہوتی ہے۔[۲]

مہمان کو مدرسہ کی طرف سے کھانا کھلانا

جو مہمان مہتمم، مدرس، یا کسی طالب علم کے ذاتی تعلق اور دوستی کی بنیاد پر مدرسہ آتے ہیں، ان کی مہمان نوازی کا تعلق اسی شخص پر ہے جس کے یہ مہمان ہیں، مدرسہ کے مال سے اس پر خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ جو مہمان مدرسہ کے ساتھ

---

[۱] خیر الفتاوی، کتاب الوقف، ج۶ص ۳۱۲

[۲] البتہ اس پر فقہی نقطہ نظر سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس رقم کی حیثیت کیا ہے؟ وقف ہے یا صدقہ وہبہ؟ وقف تو بالاتفاق نہیں ہے چنانچہ "محیط" کی درج بالا عبارت میں اس کی صاف نفی بھی کی گئی ہے اور خود اس فتویٰ میں بھی اس کو صدقہ ہی قرار دیا گیا ہے۔ اب اس کی حیثیت صدقہ یا ہبہ ہی کی ہو گی اور دونوں کے بارے میں یہ طے ہے کہ اگر دینے والے کی شرائط کی پابندی کوئی ضروری نہیں ہوتی کہ مثلاً دینے والا یہ پابندی لگائے کہ یہ رقم فلاں فلاں مصرف میں خرچ کی جائے۔ تو اس کے باوجود لینے والے پر کوئی لازم نہیں ہے کہ اسی بتائے ہوئے مصرف ہی میں خرچ کرے بلکہ کسی بھی جائز مصرف میں چاہے، خرچ کر سکتا ہے۔ جبکہ یہاں یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ دینے والے کی شرط کے مطابق ہی رقم استعمال کی جائے، چنانچہ درج بالا فتویٰ میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے! اس اشکال کا کوئی جواب اس ناکارہ کے کوتاہ نظر سے گزرا نہیں ہے البتہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد و مدرسہ کے لئے رقم دینے کو اگرچہ یہاں ہبہ یا صدقہ کہا گیا ہے لیکن یہ بعض جہات سے ہے، کلی طور پر یہ ہبہ نہیں ہے بلکہ اس میں وقف کا پہلو بھی موجود ہے اگرچہ وقف کی بعض ضروری شرائط متحقق نہ ہونے کی وجہ سے اس کو مستقل وقف قرار نہیں دیا جاتا اور وقف کے باب میں اس بات پر اتفاق ہے کہ "شرط الواقف کنصّ الشّارع"۔

تعلق کی بنیاد پر مدرسہ آتے ہیں، ان کی مہمان نوازی مدرسہ کے عام مال میں سے کی جاسکتی ہے بلکہ بعض حالات میں مصالح مدرسہ کی خاطر ان کی مہمان نوازی کرنا مناسب ہوتا ہے، تاہم مہمان نوازی کرنے میں مہمان کی رعایت کرنا اور اعتدال سے کام لیناچاہئے اور مبالغہ واسراف سے بچناضروری ہے کہ مدرسہ اور دیگر اوقاف کے اموال میں بلاوجہ مبالغہ اوراسراف کرناشرعاًجائزنہیں ہے۔

****

باب دوم

- مہتمم کے اختیارات اور ذمہ داریاں
- منصب اہتمام کی شرط
- ارباب اہتمام کی فرائض وذمہ داریاں
- ارباب اہتمام کے اختیارات وذمہ داریاں

اہتمام منصب نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے

اہتمام ہو یا دیگر عہدیں، یہ در حقیقت کوئی مناصب نہیں ہیں جس کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جائے یا حرص وطمع سے آدمی اس پر فائز ہوجائے بلکہ یہ درحقیقت بڑی بھاری ذمہ داری ہے، ایک ایسی مقدس اور نازک امانت ہے جس کی بھر پور حفاظت کرنا، متعلقہ تقاضوں کو پورا کرنا اور ہر قسم کی خیانت وکوتاہی سے بچنا لازم ہے لیکن ان ذمہ داریوں کو نبھانا کارے دارد۔ حالات کی ستم ظریفی اور لوگوں کی گرتی ہوئی ایمانی حالات کی وجہ سے ایک طرف دینی عہدوں کی ذمہ داریاں بڑھتی جارہی ہیں تو دوسری طرف کام کرنے والے باصلاحیت ومخلص افراد کی کمی کی وجہ سے خیانت اور کوتاہیوں کی بھی نت نئ شکلیں جنم لے رہی ہیں جس کی وجہ سے پہلے زمانے کی بنسبت آج کل یہ کام مزید مشکل محسوس ہوتا ہے۔

یہاں اسی مناسبت سے چند روایات ذکر کی جاتی ہے جس سے امارت، اہتمام وغیرہ مناصب کی نزاکت اور اہمیت معلوم ہوجائے، یادرہے کہ یہ روایات اصلاً تو عہدہ قضاء وامارت کے متعلق وارد ہوئیں ہیں لیکن اشتراکِ علت کی وجہ سے دیگر مناصب کو بھی شامل ہیں جہاں کوئی شخص مسلمانوں کا امیر یا ذمہ دار بنتاہے، موجودہ زمانے میں مدارس کو بھی کسی حدتک اس کے عموم میں شامل کرنا بعید نہیں۔

عن أبي ذر، قال: قلت: يا رسول الله، ألا تستعملني؟ قال: فضرب بيده على منكبي، ثم قال: «يا أبا ذر، إنك ضعيف، وإنها أمانة، وإنها يوم القيامة خزي وندامة، إلا من أخذها بحقها، وأدى الذي عليه

فيها»[١]

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول: کیا تم مجھے عامل (گورنر) نہیں بناتے؟ حضور صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کے کندھوں پر ہاتھ مار کر ارشاد فرمایا: " اے ابوذر: یقیناً تم کمزور ہو اور بے شک یہ گورنری ایک امانت ہے جو یقیناً قیامت کے دن رسوائی وپشیمانی (کا ذریعہ ثابت) ہو جائے گا مگر اس شخص کے لئے جو جائز طریقہ سے اس کو حاصل کرے اور اس سلسلہ میں آنے والی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے۔"

عن أبي ذر، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «يا أبا ذر، إني أراك ضعيفا، وإني أحب لك ما أحب لنفسي، لا تأمرن على اثنين، ولا تولين مال يتيم».[٢]

ترجمہ: حضور صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اے اباذر: بے شک میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں اور یقیناً میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے کرتا ہوں (وہ یہ ہے کہ) تم کبھی دو آدمیوں پر (بھی) امیر نہ بننا، اور یتیم کے مال کا متولی بالکل نہ بننا۔"

[أ]عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «إنكم ستحرصون على الإمارة، وستكون ندامة يوم القيامة، فنعم المرضعة وبئست الفاطمة [٣].

---

[١] صحيح مسلم،باب كراهة الإمارة بغير ضرورة،رقم الحديث: ١٨٢٥.

[٢] صحيح مسلم،باب كراهة الإمارة بغير ضرورة،رقم الحديث: ١٨٢٦.

[٣]صحيح البخاري، كتاب الفتن،باب ما يكره من الحرص على الإمارة،رقم الحديث: ٧١٤٨.

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "بے شک تم امیر بننے کی حرص کرتے ہوں (لیکن) یقیناً یہ قیامت کے دن پشیمانی کا سبب ہے۔"

اس حدیث کے آخری جملہ کی تشریح علامہ کرمانی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ فرمائی ہے کہ امارت اور عہدے کی ابتدا تو بڑی اچھی ہوتی ہے کہ مال و دولت بھی ہوتا ہے اور عزت و دبدبہ بھی، لیکن اس کی انتہاء بہت بری ہوتی ہے کہ اگر ذمہ داری پوری نہ کر سکا یا بے انصافی ہو گئی تو قیامت کے دن اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور طرح طرح کی ذلت، رسوائی اور عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔[1]

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلیٰ الله عليه وسلم: "ما من أمير عشرة إلا وهو يؤتیٰ به يوم القيامة مغلولا حتیٰ يفكه العدل أو يوبقه الجور "[2]

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دس (یا اس سے زیادہ) افراد کا جو بھی امیر ہو گا اس کو قیامت کے دن اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ یا تو عدل وانصاف (جو دنیا میں کیا تھا) اس کو آزاد کرائے یا ظلم اس کو ہلاک کرے۔"

سلف کا عہدہ قضاء سے فرار اختیار کرنا

ان جیسی احادیث وروایات کی وجہ سے بہت سے سلف صالحین کا یہ حال بن گیا تھا کہ جب قضاء وغیرہ مناصب کے لئے ان کو متعین کیا جاتا تھا تو برملا اس کا انکار کرتے

---

[1] عمدة القاري، كتاب الفتن، باب ما يكره من الحرص على الإمارة، ج٢٤ ص٢٢٧.

[2] السنن الكبرى للبيهقي، باب كراهية الإمارة وكراهية تولي أعمالها لمن رأى من نفســه ضعفا أو رأى فرضها عنه بغيره ساقطا، ج١٠ ص ١٦٣.

تھے، مشہور تابعی امام ابو قلابہ رحمہ اللہ نے جب انکار کرنے پر اصرار کیا تو کسی نے اس کی وجہ پوچھی کہ خواہ مخواہ انکار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو کارِ ثواب ہے جس میں امید ہے کہ آپ کو ثواب بھی مل جائے گا؟ آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

" السابح إذَا وقع في البحر كم عسىٰ أن يسبح "[۱]

ترجمہ: "جب کوئی سمندر میں تیرتا ہے تو بہت کم وہ تیر لیتا ہے (اور اکثر ڈوب جاتا ہے)

امام ابو حنیفہ، مکحول، سفیان ثوری، عبد اللہ بن عتبہ، رجاء بن حیوۃ، قاسم بن ولید، عبد اللہ بن ادریس، وکیع بن جراح، یہ ان حضرات کی ایک فہرست ہے جن کو عہدہ قضاء قبول کرنے کا کہا گیا تو طرح طرح کے اعذار پیش کر کے اس بھاری ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا، کسی نے جا کر دربار شاہی میں دیوانوں اور پاگلوں کی طرح حرکات شروع کر دی تا کہ حکام کے دل و دماغ سے اس کا اعتقاد نکلے اور یوں اپنے آپ کو اس عہدہ سے محفوظ رکھ سکے، کسی نے اس سے بچنے کی خاطر جلدی مرنے کی دعائیں مانگی جو بروقت قبول ہوئی، کسی نے شہر سے خفیہ طور پر نکل کر باہر گمنامی کی زندگی گزاری، تو کسی نے حکام کے ہاں اپنے آپ کو مفلوج سا دکھایا، غرض نت نئے اعذار ظاہر کر کے یہ نازک ذمہ داری سر پر لینے سے بچ گئے۔[۲]

لیکن یاد رہے کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قضاء یا اہتمام کوئی بری چیز

---

[۱] أخبار القضاة، ج۱ص۲۳.

[۲] ان باتوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: قاضی ابو بکر وکیع رحمہ اللہ کی "اخبار القضاۃ"۔ اور امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب "سنن کبریٰ" باب كراهية الإمارة وكراهية تولي أعمالها لمن رأىٰ من نفسه ضعفا أو رأىٰ فرضها عنه بغيره ساقطا، ج۱۰۔

ہے اور کسی بھی حال میں اس کے قریب جانا جائز نہیں ہے بلکہ اگر کسی شخص میں اس کام کی اہلیت موجود ہے اور اس کو اپنے اوپر اعتماد ہو کہ اس راہ میں آنے والی ذمہ داریوں کو پورا کر پائے گا اور متعلقہ کوتاہیوں اور منکرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا تو اس کے لئے یہ عہدہ قبول کرنا کوئی ناجائز نہیں ہے بلکہ اگر علاقہ میں ضرورت ہو اور اس کے علاوہ کوئی صلاحیت رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں یا متعلقہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہوں تو ایسی صورت میں با اہل افراد کے لئے ان عہدوں کو قبول کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ کسی حد تک ضروری بن جاتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ ان جیسی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

هذا الحديث أصل عظيم في اجتناب الولايات لا سيما لمن كان فيه ضعف عن القيام بوظائف تلك الولاية وأما الخزي والندامة فهو في حق من لم يكن أهلا لها أو كان أهلا ولم يعدل فيها فيخزيه الله تعالى يوم القيامة ويفضحه ويندم على ما فرط وأما من كان أهلا للولاية وعدل فيها فله فضل عظيم تظاهرت به الأحاديث الصحيحة.[1]

ترجمہ: "یہ حدیث عہدوں اور ذمہ داریوں سے بچنے کے باب میں ایک ضابطہ (کی حیثیت رکھتی) ہے، خصوصاً اس شخص کے لئے جو متعلقہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عاجز ہو، رہاں (قضاء وغیرہ مناصب کا قیامت کے دن) رسوائی اور ندامت کا باعث بننا، تو یہ اس شخص کے لئے ہو گا جو اس کام کا اہل نہ تھا یا اہلیت تو تھی لیکن انصاف سے کام نہیں لیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو رسوا و ذلیل کرے گا

[1] شرح النووي على مسلم، باب كراهة الإمارة بغير ضرورة.

اور وہ اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو جائے گا، رہاں وہ شخص جو اس کام کا اہل ہو اور اس میں انصاف سے کام لے (یعنی اپنی ذمہ داریاں اچھی طریقہ سے پوری کرے) تو اس کے لئے بڑی فضیلت ہے جو صحیح احادیث میں موجود ہے۔"

مہتمم بننے کی صلاحیت و شرائط

مقدمہ میں تفصیل سے ذکر کیا جاچکا ہے کہ مہتمم بننے کے لئے دو بنیادی شرائط ہیں:

۱۔ امین ہو یعنی جس شخص کو مہتمم بنایا جارہا ہو، وہ خیانت کا عادی نہ ہو، اور خیانت جس طرح مال و دنیا کے کمانے کے لئے ہوتی ہے یوں ہی جاہ و جلال اور عزت و دبدبہ کے سلسلہ میں بھی خیانت کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اہتمام کا منصب سنبھالنے کے لئے ضروری ہے کہ ان جیسی خیانتوں سے پاک اور کسی قابل اعتماد شخص کے کندھوں پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالی جائے۔

۲۔ قدرت یعنی متعلقہ کام کرنے کی صلاحیت: یعنی اہتمام کے نتیجے میں جو کچھ ذمہ داریاں اس کے سر عائد ہوں گی، ان کو انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود ہو، پھر مدارس کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے اس کی ذمہ داریاں بھی مختلف ہوتی ہیں، مثلاً تحفیظ کے مدارس اور درسِ نظامی کے مدارس کی ضروریات مختلف ہیں، بنین اور بنات کے مدارس کے بہت سے مقتضیات جدا جدا ہیں، کل وقتی اور جزء وقتی مدارس سے متعلق ذمہ داریاں بھی ایک جیسے نہیں ہیں، یوں ہی چھوٹے علاقائی اور ملکی یا عالمی سطح کے جامعات و مدارس کے مصالح بھی متنوع ہوتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدارس کی ضروریات و ذمہ داریاں پہلے کی بنسبت روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

اب جس شخص کو کسی مدرسہ کا مہتمم بنایا جارہا ہو، ضروری ہے کہ وہ متعلقہ مدرسہ کی ضروریات وتقاضوں سے واقف بھی ہوں اور اس کو کماحقہ انجام دینے کی اہلیت بھی موجود ہو، ورنہ تو ایسے شخص کو مہتمم بنانا مدرسہ کی مصلحت ہے نہ ہی شرعاً یا عقلاً اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

وراثت کی بنیاد پر منصب اہتمام سنبھالنا

اہتمام ہو یا کسی بھی دینی وشرعی امور کے متولی ہونے کا منصب، محض وراثت یا قرابت کے بنیاد پر کسی کو یہ منصب سپرد کرنا یا ازخود اس عہدہ کو سنبھالنا درست نہیں ہے جبکہ اس میں متولی بننے کی وہ شرائط موجود نہ ہو جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ مہتمم کے معذور ہو جانے یا انتقال فرمانے کے بعد اس کا بیٹا یا دیگر کوئی رشتہ دار ہی مہتمم مقرر ہو بلکہ اس میں تولیت کے لئے مطلوبہ شرائط اور مدرسہ کے مصالح کالحاظ رکھنا ضروری ہے، اگر مرحوم کی اولاد یا اس کے رشتہ دار ان دونوں باتوں پر پورے اترتے ہوں اور اربابِ مدرسہ (ممبران شوری/انتظامی کمیٹی) اسی میں کسی کو مہتمم مقرر کرنے میں مدرسہ کی مصلحت سمجھتے ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مستحسن ہے، لیکن اگر کہیں معزول مہتمم کی اولاد واقرباء میں یہ دونوں یا ان میں سے کوئی بات موجود نہ ہو تو ان کو اہتمام کی ذمہ داری دینا بھی درست نہیں۔

"الاسعاف" میں ہے:

لا یولیٰ إلا أمین قادر بنفسه أو بنائبه لأن الولایة مقیدة بشرط النظر ولیس من النظر تولیة الخائن لأنه یخل بالمقصود وكذا تولیة العاجز

لأن المقصود لا يحصل به.[١]

"بحر" میں ہے:

لا يولى إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه لأن الولاية مقيدة بشرط النظر وليس من النظر تولية الخائن لأنه يخل بالمقصود وكذا تولية العاجز لأن المقصود لا يحصل به.[٢]

امام قرافی رحمہ اللہ نے شرعی مناصب توارث کے بنیاد پر کسی کے متولی بنانے کو حرام بدعت کی اقسام میں سے شمار فرمایا، چنانچہ "الفروق" میں ہے:

(القسم الثاني) : محرم، وهو بدعة تناولتها قواعد التحريم وأدلته من الشريعة كالمكوس والمحدثات من المظالم المنافية لقواعد الشريعة كتقديم الجهال على العلماء وتولية المناصب الشرعية من لا يصلح لها بطريق التوارث وجعل المستند لذلك كون المنصب كان لأبيه، وهو في نفسه ليس بأهل.[٣]

مہتمم کے اختیارات کے متعلق بنیادی ضابطہ

مہتمم کے اختیارات کا دائرہ کار کیا ہے؟ کون کونسے امور وہ انجام دے سکتا ہے اور کن باتوں کا اس کو اختیار نہیں ہے؟ یہ اور اس سے متعلق جملہ مسائل کی اصل بنیاد یہ ہے کہ مہتمم کی حیثیت شرعاً متولی کی ہے اور متولی امین ہوتا ہے جو وقف سے متعلق امور

---

[١] الإسعاف فى أحكام الأوقاف، باب الولاية على الوقف،ص:٤٩.

[٢] البحر الرائق ،كتاب الوقف،ج٥ص ٢٤٤.

[٣] الفروق للقرافي،الفرق الثاني والخمسون والمائتان بين قاعدة ما يحرم من البدع وينهى عنه وبين قاعدة ما لا ينهى عنه منها،ج٤ص ٢٠٢.

میں امانت کے تقاضوں کے لحاظ رکھنے کا مکلف ہوتا ہے، لہٰذا مہتمم کی ذمہ داری ہے کہ وہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مدرسہ سے متعلق تمام امور میں اسی مدرسہ کے مصالح و منافع کا بھرپور لحاظ رکھے اور مدرسہ سے متعلق کسی بھی اقدام کرنے سے پہلے اس بات کا جائزہ لے کہ یہ اقدام مدرسہ کے مصالح میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر وہ دیانتداری کے ساتھ کسی بات کو مدرسہ کے مصلحت کے لئے واقعۃً مفید یا ضروری سمجھتا ہے تو اس کو اختیار کرنا جائز یا ضروری ہے ورنہ تو مدرسہ کے مصالح اور مفاد کے خلاف تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

علامہ طرابلسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ویتحریٰ فی تصرفاته النظر للوقف و الغبطة لأن الولاية مقيدة به حتیٰ لوآجر الوقف من نفسه أو سكنه بأجرة المثل لايجوز.[1]

"فتاویٰ قاضی خان" میں ہے:

وعن أبي بكر البلخي رحمه الله تعالیٰ أنه سئل عن الوقف علیٰ المسجد أيجوز لهم أن يبنوا منارة من غلة المسجد قال إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به وإن كان بحال يسمع الجيران الأذان بغير منارة فلا أریٰ لهم أن يفعلوا ذلك.[2]

---

[1] الإسعاف فی أحكام الأوقاف،فصل فی بیان مایجوز للقیم من التصرف ومالایجوز،ص:٥٦.

[2] فتاوی قاضیخان،كتاب الوقف،باب الرجل يجعل داره مسجدا،ج ٣ص ١٦٤.

مصالحِ مدرسہ کا معیار

رہی یہ بات کہ مصالح مدرسہ کا معیار کیا ہے؟ کونسی چیزیں اس میں داخل ہیں اور کونسی نہیں؟ تو اس کا کوئی جچا تُلا جواب مشکل ہے کیونکہ زمانے اور ماحول کے اختلاف سے وہاں لوگوں اور اداروں کے مصالح مختلف ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام نے اپنے وقت کی مناسبت سے جن چیزوں کو مسجد یا مدرسہ کے مصالح میں شمار فرمایا ہے، ضروری نہیں ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی انہی چیزوں کو مصالح شمار کیا جائے بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ اس میں سے بعض چیزیں اب مصالح میں داخل نہ ہو اور بعض جن چیزوں کو ان حضرات نے مصالح میں سے شمار نہیں فرمایا، وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے مصالح میں داخل ہو جائے۔

چنانچہ بعض فقہاء کرام نے اپنے ماحول وزمانے کے پیش نظر تیل، چٹائی اور پنکھے کو مسجد کے مصالح میں سے شمار نہیں فرمایا جبکہ اب یقیناً بجلی، نیچے بچھانے کے لئے چٹائی دریاں اور مسجد کے محل وقوع کے مطابق پنکھیں مسجد کے مصالح میں داخل ہیں، "بحر" میں ہے:

هل للقيم شراء المرواح من مصالح المسجد فقالا لا ثم رمز للعلاء الترجماني فقال الدهن والحصير والمراوح ليس من مصالح المسجد وإنما مصالحه عمارته ثم رمز لأبي حامد وقال الدهن والحصير من مصالحه دون المراوح قال يعني مولانا بديع الدين وهو أشبه للصواب وأقرب إلى غرض الواقف. اهـ[1]

---

[1] البحر الرائق، كتاب الوقف، ج٥ص٢٢٨.

لہٰذا کسی چیز کے مصالح میں سے ہونے نہ ہونے میں زمانے اور ماحول کے لحاظ سے تغیر ہو سکتا ہے، البتہ اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے ماحول وزمانے کے لحاظ سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے جو چیزیں مدرسہ کے مفاد ومصلحت کے پیش نظر ضروری یا مفید ہوں وہ مصالح میں داخل ہیں اور جو چیزیں ایسی نہ ہوں بلکہ وہ یا تو مدرسہ کے مفاد کے خلاف ہو یا اس میں مدرسہ کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہو، وہ مدرسہ کے مصالح میں داخل نہیں ہے، البتہ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہاں مفاد ومصلحت کا مطلب وہی ہے جو مالِ یتیم کے متعلق فقہاء کرام نے ذکر فرمایا ہے کیونکہ مدرسہ ومسجد ہو یا دیگر اوقاف، وہ انسان کی طرح مکلف تو ہے نہیں جس کو آخرت کے لئے صدقات وعطیات کی ضرورت ہو اور نہ ہی یہ اوقاف انسان کی طرح زکوۃ وصدقات کے مکلف ہیں، لہٰذا مدارس کے مال میں سے بلاوجہ تبرع وصدقہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

خائن اور نااہل مہتمم کو معزول کرنا لازم ہے

اگر منصبِ اہتمام یا انتظام سنبھالنے کے باوجود کوئی شخص مدرسہ کے معاملات میں مالی خیانت کا شکار ہو یا نااہل ہو کر مدرسہ کے معاملات مناسب طریقہ پر انجام دینے کی استعداد نہ رکھتا ہو یا وہ مدرسہ کے معاملات میں کسی اور بے راہ روی کا عادی ہو جائے، تو ایسے مہتمم کو معزول کرنا شرعاً لازم ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختیار ہر فرد کو حاصل نہیں ہے کہ وہ مہتمم کے عزل ونصب کا فیصلہ کرے بلکہ با اختیار افراد یا مجلسِ شوریٰ کے اراکین ہی یہ فیصلہ کرسکتے ہیں، اگر ایسے کوئی با اختیار افراد موجود نہ ہوں تو علاقہ کے دیانت دار افراد کو چاہئے کہ وہ حکمت ومصلحت کے ساتھ اور خیر خواہی کے جذبے سے مہتمم کے سامنے اصل مسئلہ اور اس کی متبادل صورت سامنے رکھ لیں۔

"در مختار" میں ہے:

(وينزع) وجوبا بزازية (لو) الواقف درر فغيره بالأولى (غير مأمون) أو عاجزا أو ظهر به فسق كشرب خمر ونحوه فتح..(وإن شرط عدم نزعه) أو أن لا ينزعه قاض ولا سلطان لمخالفته لحكم الشرع فيبطل كالوصي فلو مأمونا لم تصح تولية غيره أشباه.[١]

مالیات (آمد و خرچ) کے متعلق مہتمم کی ذمہ داری

مہتمم امین ہوتا ہے اور مالیات کے متعلق امانت کا مقتضایہ ہے کہ:

۱۔ چندہ وصول کرتے وقت مصرف / مد کی تعیین کی جائے اور اگر کوئی مال کسی خاص مصرف یا کسی خاص کام میں خرچ کرنے کے لئے دیا جائے تو دینے والے کے منشا کے مطابق وہ مال اسی مصرف اور اسی کام میں خرچ کیا جائے۔

۲۔ زکوۃ اور دیگر صدقات واجبہ کو دیگر اموال سے الگ رکھ کر خاص طلبہ کی ضروریات ہی میں خرچ کیا جائے۔

۳۔ اس کے علاوہ دیگر اموال کو مدرسہ کے مصالح میں ہی احتیاط کے ساتھ خرچ کیا جائے۔

۴۔ خرچ کرتے ہوئے ایک تو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ:

الف: جہاں خرچ کیا جارہا ہے وہ واقعۃً مدرسہ کے مصالح میں سے ہے یا نہیں؟ اگر ارباب انتظام دیانت داری کے ساتھ اس جگہ خرچ کرنے کو مدرسہ کے مصالح میں سمجھتے ہیں تبھی مدرسے کا مال خرچ کیا جائے۔

---

[١] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الوقف، ج٤ص ٣٨٠.

ب: دوسری اس بات کا بھی لحاظ رکھنا لازم ہے کہ مدرسہ کے مصالح میں تدریج سے کام لیا جائے۔ تمام مصالح کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ کچھ زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اور کچھ کم، کچھ فوری نوعیت کے مصالح ہوتے ہیں اور کچھ میں دیر کرنا بھی زیادہ مضر نہیں ہوتا، لہٰذا اربابِ اہتمام کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام مصالح میں تدریج سے کام لیکر ہر ہر مصلحت کو اس کے مطابق حل کریں۔ مثال کے طور پر مدرسہ میں تعمیر کرنا بھی مصلحت ہے، تعمیر میں موقع و محل کی مناسبت سے سہولت اور تزیین کا سامان کرنا بھی بعض اوقات مصلحت بن سکتا ہے اور مدرسین و دیگر ملازمین کو تنخواہ دینا بھی مصلحت ہے، اب ان مصالح میں سے کس مصلحت میں کس قدر رقم صرف کی جائے؟

اس میں ادارہ کی مصلحت اندیشی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا یہ جو بہت سے مدارس میں دیکھا جاتا ہے کہ مدرسین اور ملازمین کی تنخواہیں تو بہت کم مقرر کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں پوری طرح مدرسہ کے کام میں استعمال ہونے کی بجائے منتشر رہتی ہیں لیکن غیر ضروری عمارات میں چندے کا استعمال بڑی فیاضی کے ساتھ کیا جاتا ہے، یہ کسی طرح درست نہیں۔

"بحر" میں ہے:

وقيدوا بالمسجد إذ نقش غيره موجب للضمان إلا إذا كان مكانا معدا للاستغلال تزيد الأجرة به فلا بأس به وأرادوا من المسجد داخله لقول صاحب النهاية ولأن في تزيينه ترغيب الناس في الاعتكاف والجلوس في المسجد لانتظار الصلاة وذلك حسن اهـ. فيفيد أن تزيين خارجه مكروه وأما من مال الوقف فلا شك أنه لا يجوز للمتولي فعله مطلقا لعدم الفائدة فيه خصوصا إذا قصد به

حرمان أرباب الوظائف كما شاهدناه في زماننا من دهنهم الحيطان الخارجة[1]

"فتاویٰ شامی" میں ہے:

والحاصل مما تقرر وتحرر أنه يبدأ بالتعمير الضروري حتى لو استغرق جميع الغلة صرفت كلها إليه ولا يعطى أحد ولو إماما أو مؤذنا، فإن فضل عن التعمير شيء يعطى ما كان أقرب إليه مما في قطعه ضرر بين وكذا لو كان التعمير غير ضروري بأن كان لا يؤدي تركه إلى خراب العين، لو أخر إلى غلة السنة القابلة فيقدم الأهم فالأهم ثم من لا يقطع يعطى المشروط له إذا كان قدر كفايته وإلا يزاد أو ينقص.[2]

ج: احتیاط واعتدال کے ساتھ خرچ کیا جائے مسرفانہ خرچ اور غیر ضروری وغیر مفید اخراجات سے گریز کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ مدرسہ کی طرف سے لین دین میں قیمت مثل اور اجر مثل کا لحاظ رکھنا لازم ہے یعنی عام معمول سے بہت زیادہ قیمت پر کوئی چیز مدرسہ کی رقم سے خریدنا، یا مدرسہ کی چیز کو عام معمول سے بہت کم قیمت پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے یہی حکم کرایہ پر لین دین کا بھی ہے، "درر" میں ہے:

(وبالمثل يؤجر) لا بأقل من أجر المثل دفعا للضرر عن الوقف.[3]

---

[1] كتاب الصلاة، باب نقش المسجد، ج٢، ص٤٠.

[2] كتاب الوقف، مطلب في قطع الجهات لأجل العمارة، ج٤، ص٣٧٠.

[3] الدرر والغرر، كتاب الوقف، ج٢ص١٣٩.

ملازم / مدرس رکھنے کے متعلق مہتمم کی ذمہ داری

اس باب میں اہتمام اور امانت کے تقاضا یہ ہے کہ:

الف: مدرسہ کی ضروریات اور تقاضوں کو دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا جائے کہ کیا مدرس یا ملازم رکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر واقعۃً مدرسہ کے مفاد و مصالح کی روشنی میں مدرس و ملازم رکھنا ضروری یا مفید ہو تب ہی آگے اقدام کیا جائے ورنہ تو اس کے بغیر مدرسہ کی طرف سے ایسا فیصلہ کرنا شرعاً درست نہیں، "بحر" میں ہے:

والحاصل أن تصرف القاضي في الأوقاف مقيد بالمصلحة لا أنه يتصرف كيف شاء فلو فعل ما يخالف شرط الواقف فإنه لا يصح إلا لمصلحة ظاهرة ولذا قال في الذخيرة وغيرها القاضي إذا قرر فراشا في المسجد بغير شرط الواقف وجعل له معلوما فإنه لا يحل للقاضي ذلك ولا يحل للفراش تناول المعلوم.[۱]

"در مختار" میں ہے:

ليس للقاضي أن يقرر وظيفة في الوقف بغير شرط الواقف، ولا يحل للمقرر الأخذ إلا النظر على الواقف بأجر مثله قنية.[۲]

ب: اس کے بعد مصلحت اور اس کی مفاد کو دیکھتے ہوئے جو شخص زیادہ مناسب ہو، اسی کو منتخب کیا جائے اور تدریس و ملازمت کے لئے اسی کی خدمات حاصل کی جائیں۔

---

[۱] البحر الرائق كتاب الوقف، ج٥ص ٢٤٥.

[۲] الدر المختار، كتاب الوقف، ج٤ص ٤٣٥.

ج: کسی مدرس یا ملازم کو برطرف کرنے یا اس کے بجائے کسی دوسرے کو رکھنے میں بھی اسی ضابطہ کی پابندی لازم ہے، مدرسہ کے مصالح ومفاد کی روشنی میں یہ سارا کام انجام دینا چاہئے، مہتمم محض ذاتی اغراض وتعلقات کے تحت اگر ملازم رکھتا یا معزول کرتا ہے تو شرعاً بھی گناہ ہے اور ایسی صورت میں ملازم کے اجرت کی ذمہ داری بھی مدرسہ کے سر عائد نہیں ہوگی بلکہ مہتمم ذاتی طور پر اس کا ضامن ہوگا۔

فقہائے کرام تو یہاں تک تحریر فرماتے ہیں کہ اگر متولی وقف کی خدمت کے لئے کسی ملازم کو رکھے لیکن عام طور پر ایسے کام پر جو اجرت دی جاتی ہے (جس کو فقہی اصطلاح میں "اجرتِ مثل" کہا جاتا ہے) اس سے زیادہ اجرت مقرر کی جائے تو وقف کے مال سے اجرت دینا درست نہیں ہے بلکہ طے شدہ پوری ہی اجرت متولی پر اس کی ذاتی حیثیت سے عائد ہوگی، "فتاوی قاضی خان" میں ہے:

المتولي إذا استأجر رجلا في عمارة المسجد بدرهم و دانق و أجر مثله درهم فاستعمله في عمارة المسجد و نقد الأجر من مال الوقف قالوا يكون ضامنا جميع ما نقد لأنه لما زاد في الأجر أكثر مما يتغابن الناس فيه يصير مستأجرا لنفسه دون المسجد فإذا نقد الأجر من مال المسجد كان ضامنا.[1]

علامہ غانم بغدادی تحریر فرماتے ہیں:

متولي الوقف إذا استأجر رجلا في عمارة المسجد بدرهم ودانق، وأجر مثله درهم فاستعمله في عمارة المسجد، ونقد الأجر من مال

---

[1] كتاب الوقف، فصل في إجارة الأوقاف و مزارعتها، ج٣، ص١٩٧.

الوقف قالوا يكون ضامنا جميع ما نقد لأنه أوفى الأجر أكثر مما يتغابن الناس فيه فيصير مستأجرا لنفسه دون المسجد فإذا نقد الأجر من مال المسجد كان ضامنا.[1]

مدرسہ کے املاک کے متعلق ذمہ داری

مدرسہ کی زمین، عمارت، پانی بجلی، کتابیں اور دیگر تمام املاک کی حیثیت بھی امانت کی ہے لہذا ارباب اہتمام اور دیگر منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام اشیاء کو خود بھی احتیاط اور امانت داری کا لحاظ رکھتے ہوئے استعمال کریں اور ہر ایک اپنے ماتحت کی حد تک بھی یہی کوشش کریں کہ مدرسہ کی اشیاء کا ناجائز یا غیر محتاط استعمال نہ ہو، ناجائز استعمال کی مثال یہ ہے کہ:

ا: جو چیزیں مدرسہ کی طرف سے صرف اساتذہ کرام کے ساتھ ہی مختص ہوں، طلبہ یا دیگر عملہ اس کو استعمال کریں۔

۲: باہر سے جو چیزیں صرف طلبہ ہی کے نام آتی ہے، اس میں دیگر عملہ بھی شریک ہو جائیں۔

۳۔ پنکھا، بجلی، گیس وغیرہ جو چیزیں مدرسہ کی طرف سے محض ضرورت پوری کرنے کے لئے مہیا کی جاتی ہے، اس کو بلاضرورت استعمال کرنا یا استعمال کرنے میں اسراف سے کام لینا ناجائز ہے، اور غیر محتاط استعمال یہ ہے کہ عام معمول کے مطابق جس طرح کسی چیز کو استعمال کیا جاتا ہے، اس میں حد سے زیادہ کوتاہی یا غفلت کا مظاہرہ کیا جائے، "بحر" میں ہے:

---

[1] باب في الوقف، ص۳۲۷.

فإن كان ماء موقوفا على من يتطهر أو يتوضأ حرمت الزيادة والسرف بلا خلاف وماء المدارس من هذا القبيل؛ لأنه إنما يوقف ويساق لمن يتوضأ الوضوء الشرعي كذا في شرح منية المصلي.[1]

"شامی" میں ہے:

(ومكروهه: لطم الوجه)..(والإسراف) ومنه الزيادة على الثلاث (فيه) تحريما ولو بماء النهر، والمملوك له. أما الموقوف على من يتطهر به، ومنه ماء المدارس، فحرام.

(قوله: فحرام) لأن الزيادة غير مأذون بها لأنه إنما يوقف ويساق لمن يتوضأ الوضوء الشرعي ولم يقصد إباحتها لغير ذلك حلية، وينبغي تقييده بما ليس بجار كالذي في صهريج أو حوض أو نحو إبريق، أما الجاري كماء مدارس دمشق وجوامعها فهو من المباح كماء النهر كما أفاده الرحمتي.[2]

مدرسہ کے مکان ودکان کرایہ پر دینا

اگر مدرسہ کے ساتھ کچھ دکان ومکانات یا کھیتی وغیرہ بھی موجود ہیں جو کرایہ پر دی جاتی ہے، تو ارباب اہتمام یا جس کو یہ اختیاد دیا جائے، ان تمام حضرات کی ذمہ داری ہے کہ مدرسہ کی طرف سے لین دین، کرایہ داری کے معاملہ کرنے میں مدرسہ کی

---

[1] البحر الرائق، كتاب الطهارة، ج١ص٣٠.

[2] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الطهارة، ج١ص١٣٢. وكذا في الأشباه والنظائر، كتاب الوقف، ج٢ص٢٥٤.

مصلحت کا پورا خیال رکھا جائے اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو تو مصالح مدرسہ کے پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ برتی جائے۔

لہٰذا اگر مدرسہ کا دکان و مکان کرایہ پر دینا ہو تو متعلقہ علاقہ میں اس جیسا دکان و مکان جتنے کرایہ پر دینے کا معمول ہو، اس سے کم کرایہ پر بالکل نہ دیا جائے ورنہ تو اگر مصالح مدرسہ سے قطع نظر کر کے ایسا کیا گیا اور عام رواج سے کرایہ اتنا کم مقرر کیا گیا جو عام طور پر مروج نہ ہو تو متولی گناہ گار ہو گا اور کرایہ دار کا صرف اس قدر اجرت دینا کافی نہیں ہو گا بلکہ بقیہ رقم بھی اس کے ذمہ دینا ضروری ہو گا، اسی طرح کرایہ دار اور معاملہ کی مدت طے کرنے میں بھی مصالح مدرسہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

"درر و غرر" میں ہے:

(متول آجره بدون أجر المثل) (لزمه تمامه كذا) (أب أجر منزل صغيره بدونه) أي بدون أجر المثل يعني لزمه أيضا تمامه إذ ليس لكل منهما ولاية الحط والإسقاط كذا في العمادية.[1]

"بحر" میں ہے:

ثم اعلم أن المتولي إذا آجر بأقل من أجرة المثل بنقصان فاحش حتى فسدت لا ضمان عليه وإنما يلزم المستأجر أجرة المثل وقد توهم بعض من لا خبرة له ولا دربة أنه يكون ضامنا ما نقص وهو غلط صرح به العلامة قاسم في فتاواه مستندا إلى النقول الصريحة.[2]

"در مختار" میں ہے:

---

[1] درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب الوقف، ج٢ص١٣٩.

[2] البحر الرائق، كتاب الوقف، ج٥ص ٢٥٨.

(متولي أرض الوقف آجرها بغير أجر المثل يلزم مستأجرها) أي مستأجر أرض الوقف لا المتولي كما غلط فيه بعضهم (تمام أجر المثل) على المفتى به كما في البحر عن التلخيص وغيره.[١]

مدرس کی تنخواہ کی مقدار

مدرس یا دیگر ملازمین کی تنخواہ کتنی ہو؟ شریعت نے اس کی کوئی خاص تحدید فرمائی ہے اور نہ ہی ان جیسے امور کی مکمل حد بندی مناسب ہوتی ہے۔ مدرس یا دیگر ملازمین، مدرسہ کے ساتھ ان کا اصولی طور پر "اجارہ" کا عقد طے ہوتا ہے جس میں تنخواہ کی تقرری جانبین کی باہمی رضامندی اور اتفاق پر موقوف ہوتی ہے، جس مقدار پر دونوں فریق اتفاق کریں، اسی کا اعتبار ہو گا۔

تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ مدرسہ کے ارباب انتظام واہتمام کی حیثیت شرعا امین ومتولی کی ہوتی ہے اور مدرسہ کے اموال وآمدنی ان کے ہاتھ میں امانت کی حیثیت سے جمع ہوتی ہے، اس لئے ان حضرات کی ذمہ داری ہے کہ آمدنی کے استعمال میں متعلقہ ادارے کے واقعی مصالح کا اچھی طرح لحاظ رکھا کریں اوراسی کے مطابق رقم خرچ کریں، جس مصرف میں جس قدر رقم استعمال کرنے میں ادارے کی مصلحت ہو، اسی قدر رقم استعمال کی جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دیگر مصارف کی بنسبت تدریس کرنے والے حضرات کی تنخواہوں پر خصوصی طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ حضرات اگر معاشی طور پر خوشحال اور فارغ البال رہے تو اس کی برکت سے درس وتدریس کا کام معیاری رہے گا اور اگر معاشی طور پر تنگ دامنی

---

[١] الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الإجارة، ج٦ص٢٠.

کے شکار ہوں تو یا تو بے توجہی اور مشکلات کے ساتھ تدریس کرتے رہیں گے اور یا مدرسہ کو خیر باد کہہ کر کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں گے ،دونوں صورتوں میں علم و تعلیم کا نقصان ہو گا۔ لہٰذا یہ جو بعض جگہ دیکھنے میں آتا ہے کہ غیر ضروری تعمیرات میں لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کیاجاتاہے لیکن مدرسین کی تنخواہیں اس کی بنسبت بہت ہی اور بالکل غیر معیاری ہوتی ہیں، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے بلکہ خود فقہی نقطہ نظر سے بھی ایسااقدام قابلِ اشکال ہے۔

"در مختار" میں ہے:

الشعائر التي تقدم شرط أم لم يشترط بعد العمارة هي إمام وخطيب ومدرس ووقاد وفراش ومؤذن وناظر..

یاد رہے کہ یہاں عمارت سے بقدر کفایت اور بقدرِ ضرورت عمارت مراد ہے، چنانچہ "شامی" میں اسی صفحہ پر ایک دوسرے مسئلہ کے ضمن میں ہے:

(قوله: قدر العمارة) أي القدر الذي يغلب على ظنه الحاجة إليه حموي ويصرف الزيادة على ما شرط الواقف أشباه.[1]

خاص وقف / مدرسہ کی مصلحت کے علاوہ اس میں ایک اور دینی مصلحت بھی ہے جس کی طرف حضرات فقہائے کرام نے "ادب القاضی" میں اشارہ فرمایاہے، چنانچہ "صنوان القضاء" میں ہے؛

ولا يُعتبر مؤنة الإمام في زماننا بمؤنة النبيّ عليه السّلام والخلفاء الرّاشدين، لأنّه عليه السّلام منصورا بالرّعب وكان الإسلامُ غضّا

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الوقف، ج٤ص٣٧١.

طريًا في زمان الخلفاء يهابهم النّاسُ لِبقاء أثر النبوّة في وقتهم، وقـدْ تغيّرتِ الأمور والقلوب في زماننا فلو لمْ يتكلّف الإمام وعاش بين النّاس كما عاشوا لمْ يكنْ مُطاعا وتعطّلت أمور الشّرع.[١]

دوران مدت کرایہ کا زیادہ یا کم ہونا

یہ صورت بھی اکثر پیش آتی ہے کہ کرایہ داری کے معاملہ کرتے وقت جو کچھ اجرت طے کی گئی تھی، وہ اس وقت کے لحاظ سے مناسب اور عام معمول کے مطابق تھی لیکن ابھی معاملہ کی مدت پوری نہیں ہوئی کہ کرایہ میں خاطر خواہ حد تک اضافہ ہوا، ایسی صورت میں کیا دوران مدت دکان واپس لی جاسکتی ہے یا کرایہ میں جبری اضافہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اگر کوئی شخص اپنی ذاتی چیز مثلاً کوئی دکان و مکان کرایہ پر دیدے تو معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک مالک ہی کرایہ کا مستحق ہے جو معاہدہ میں طے پایا تھا، معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے کوئی فریق اس میں یکطرفہ طور پر کمی زیادتی کرنے کا شرعاً مجاز نہیں ہے، جہاں تک اوقاف، مساجد اور مدارس کے اشیاء کا مسئلہ ہے یعنی مدرسہ وغیرہ کی کوئی چیز ایک مدت کے لئے کرایہ پر دی تھی اور مدت ہونے سے پہلے ہی عام عرف میں ان اشیاء کا کرایہ بڑھ جائے تو اگر یہ اضافی معمولی ہو یعنی اس حد تک کرایہ نہ بڑھے کہ عام عرف میں پہلے جیسا کرایہ مقرر ہی نہ کیا جاتا ہو، اس صورت میں تو کرایہ داری کا معاملہ پہلے کی طرح برقرار رہے گا اور متولی کو زبردستی کرایہ بڑھانے کا اختیار نہیں ہے اور اگر کرایہ میں غیر معمولی زیادتی ہو تو اس صورت میں راجح قول یہی ہے کہ متولی کو کرایہ

---

[١] صوان القضاء وعنوان الافتاء،الفصل الخامس بيان رزق القاضي،ج٢ص٢٩٦.

بڑھاکر کم از کم عام عرف کے مطابق مقرر کرلیناچاہئے ورنہ توکرایہ داری کا معاملہ ہی ختم کرے۔

"ددروغرر"میں ہے:

(فلو رخص أجره) بسبب من الأسباب بعد العقد على مقدار (لا يفسخ) العقد للزوم الضرر (ولو زاد) أي أجره (على أجر مثله قيل يعقد به) أي بأجر مثله (ثانيا للآتي) من الزمان. وأما الماضي فله حصته من الأجر الأول (وقيل لا) أي لا يعقد به ثانيا.[1]

"بحر"میں ہے"

وإن كانت الإجارة الأولى بأجرة المثل ثم ازداد أجر مثله كان للمتولي أن يفسخ الإجارة وما لم يفسخ كان على المستأجر الأجر المسمى اهـ. وفي الحاوي ويفتى بالضمان في غصب عقار الوقف وغصب منافعه وكذا كل ما هو أنفع للوقف فيما اختلف العلماء فيه حتى نقضت الإجارة عند الزيادة الفاحشة نظرا للوقف وصيانة لحق الله تعالى وإبقاء للخيرات.[2]

"درمختار"میں ہے:

---

[1] الدرر والغرر، كتاب الوقف، ج٢ص١٣٩.

[2] البحر الرائق، كتاب الوقف، ج٥ص ٢٥٦.

(فلو رخص أجره) بعد العقد (لا يفسخ العقد) للزوم الضرر (ولو زاد) أجره (علیٰ أجر مثله قيل يعقد ثانيا به علیٰ الأصح) في الأشباه ولو زاد أجر مثله في نفسه بلا زيادة أحد فللمتولي فسخها به يفتیٰ.[1]

مدرسہ اور طلبہ کے متعلق مہتمم کی مسئولیت

مدرسہ ، مدرسہ کے املاک اور طلبہ یہ سب امانت ہیں اور مہتمم کی رعایا کی طرح ہیں، لہٰذا شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کی بہتری اور مصلحت کا خیال رکھنا لازم ہے اور یہ منصب اہتمام کی ذمہ داری اور مسئولیت میں داخل ہے ، لہٰذا ارباب اہتمام کی ذمہ داری صرف مالیات یا تعلیمات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ضرورت کے وقت اپنے رعایا کی تربیت اور ناجائز اعمال واخلاق سے ان کو روکنے کی کوشش کرنا بھی ان کی مسئولیت میں داخل ہے، البتہ ہدایت اور عملی تربیت پانا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اس لئے اس کا انسان مکلف بھی نہیں بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنا کافی ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ:

كلكم راع ومسئول عن رعيته، فالإمام راع وهو مسئول عن رعيته، والرجل في أهله راع وهو مسئول عن رعيته، والمرأة في بيت زوجها راعية وهي مسئولة عن رعيتها، والخادم في مال سيده راع وهو مسئول عن رعيته.[2]

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب الوقف، فصل إجارة الواقف،ج٤ص ٤٠٣.

[2] صحيح البخاري، باب: العبد راع في مال سيده، ولا يعمل إلا بإذنه،رقم الحديث:٢٤٠٩.

مدرسہ کے متعلقین وملازمین کے ساتھ تعامل وبرتاؤ کا طریقہ کار

قرآن کریم نے طلاق کا طریقہ کار بتلاتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تعلیم وہدایت دی کہ:
{فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ} [البقرة : ۲۲۹]

یعنی اگر اپنی بیویوں کو نکاح میں برقرار رکھنا منظور ہو تو اچھے اور عام معمول کے مطابق نیک طریقہ سے ان کو رکھو اور اگر ان کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنا چاہتے ہو تو بھی احسان واکرام کے ساتھ آزاد کرو، یہ ہدایت صرف نکاح وطلاق کے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں ، ہر جوڑ وتوڑ اور عزل ونصب میں اس کی رعایت رکھ لینی چاہئے کہ اگر کسی کو ملازم رکھنا ہو تو رکھتے ہوئے بھی ظلم وزیادتی، حق تلفی اور زیادتی سے گریز کرنا ضروری ہے اور کسی کو فارغ کرنے کا مرحلہ ہو تو بھی لڑائی جھگڑے، قطع تعلقی اور بے اکرامی سے بچتے ہوئے صفائی وستھرائی اور احسان واحترام کے ساتھ اس کو فارغ کردینا چاہئے، لہٰذا مدرس ہو یا عام ملازم، اس کے عزل ونصب کے وقت اس ہدایت کا لحاظ رکھ لینا چاہئے۔

* *

بابِ سوم

- مدرسین سے متعلق مسائل واحکام
- مدرسین کے فرائضِ منصبی
- تنخواہ ومشاہرہ سے متعلق مسائل واحکام
- مدرسین کو ملنے والی سہولیات ومراعات
- مدرسین کے عزل ونصب سے متعلق احکام

مدرس لینے کا معیار وضابطہ

مساجد و مدارس یا دیگر اوقاف میں بلا حاجت کوئی عہدہ و ملازمت بنانا اور وقف کی جانب سے کسی کو ملازم مقرر کرنا شرعاً درست نہیں ہے اور متولی کو یہ اختیار نہیں ہے، لہٰذا مدرسہ کی طرف سے تبھی کسی کو مدرس مقرر کیا جاسکتا ہے جبکہ مدرسہ میں اس کی ضرورت ہو یا اربابِ اختیار کے نزدیک تقرری میں مدرسہ کی مصلحت راجح ہو اور جس شخص کی تقرری کرنی ہو ،اس میں تدریس وغیرہ متعلقہ ذمہ داری کی لیاقت واہلیت موجود ہو جس کے لئے اس کی تقرری کی جارہی ہو، لہٰذا اگر مدرسہ میں نئے مدرس کی ضرورت نہ ہو نہ ہی اس میں مدرسہ کی کوئی خاص مصلحت ہو یا مدرسہ میں ضرورت تو موجود ہو لیکن اس کے لئے کسی ایسے شخص کی تقرری کی جائے جس میں اس کام کی صلاحیت موجود نہ ہو، یہ دونوں صورتیں شرعاً درست نہیں۔

"بحر" میں ہے:

يجوز للمستأجرين غرس الأشجار والكروم في الأراضي الموقوفة إذا لم يضر بالأرض بدون صريح الإذن من المتولي دون حفر الحياض وإنما يحل للمتولي الإذن فيما يزيد الوقف به خيرا.[١]

"شامی" میں ہے:

وإنما يحل للمتولي الإذن فيما يزيد الوقف به خيرا.[٢]

بعض جگہ دیکھا جاتا ہے کہ ان باتوں کا لحاظ رکھے بغیر ہی تقرری ہوتی ہے مثلاً اپنے ادارے کے کسی فاضل یا کسی شاگرد و متعلق کو محض اس لئے مدرسہ کا مدرس مقرر

---

[١] البحر الرائق، كتاب الوقف،ج٥ص٢٢١.

[٢] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الوقف،ج٤ص ٤٥٤.

کرنا کہ مدرسہ کے ساتھ نسبت بر قرار رہے، ارباب اہتمام یا چندہ دہندگان کے متعلقین میں سے کسی کو مدرسہ کی طرف سے تدریس کے لئے منتخب کرنا، وغیرہ، اس میں احتیاط کی ضرورت ہے اور درج بالا شرائط کے بغیر کسی کو مدرسہ کی طرف سے مدرس مقرر کرنا درست نہیں۔

"درمختار" و "شامی" میں ہے:

وفي الوهبانية لو زاد المتولي دانقا علىٰ أجر المثل ضمن الكل لوقوع الإجارة له.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله: لو زاد المتولي دانقا) صورته استأجر المتولي رجلا في عمارة المسجد بدرهم ودانق وأجرة مثله درهم ضمن جميع الأجرة من ماله لأنه زاد في الأجر أكثر مما يتغابن فيه الناس، فيصير مستأجرا لنفسه فإذا نقض الأجر من مال المسجد، كان ضامنا بحر عن الخانية والدانق سدس الدرهم والمدار علىٰ ما لا يتغابن فيه أي ما لا يقبل الناس الغبن فيه إذ ما دونه يسير لا يمكن الاحتراز عنه.[1]

اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ اگر مدرسہ میں مدرس، خادم وغیرہ کی واقعی ضرورت ہو تو بھی اس کو اجرتِ مثل پر ہی مقرر کیا جا سکتا ہے، اگر متولی / مہتمم نے اجرتِ مثل سے اس قدر زیادہ اجرت مقرر کر دی جو غبن فاحش کی حد تک پہنچے یعنی اس علاقے میں اس جیسے کام کے لئے اس قدر اجرت دینے کا عرف نہ ہو تو اس کی ذمہ داری متولی کے

[1] الدر المختار مع ردّ المحتار، كتاب الوقف، ج٤ ص٣٧١.

کندھوں پر ہوگی اور وہ اپنے ہاں سے اجرت دینے کا مکلف ہوگا، اب اگر مدرسے میں مزید مدرس رکھنے یا کسی خادم وغیرہ مقرر کرنے کی بالکل ضرورت ہی نہ ہو تو مدرسہ کی طرف سے اس کو مقرر کرنا اور مدرسہ کے فنڈ سے اس کو اجرت دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے!

"اشباہ" میں ہے:

لیس للقاضي أن یقرر له وظیفة في الوقف بغیر شرط الواقف، ولا یحل للمقرر له الأخذ إلا النظر علی الوقف.[1]

بعض مدارس میں ضابطہ ہوتا ہے کہ مدرس کی اولاد میں سے ایک یا دو افراد کو مدرس مقرر کیا جاتا ہے، اس طرح ضابطہ بنانے میں فی نفسہ مضائقہ نہیں ہے جب تقرری میں درج بالا دونوں باتوں کی پوری رعایت رکھی جائے۔

مدرس کا بنیادی فرضِ منصبی

معاوضہ پر کام کرنے والا مدرس جب اس کے کام کرنے کے اوقات متعین کر دئے گئے ہوں کہ مثلاً صبح ۸ بجے سے ۱۰ یا ۱۲ تک مدرسہ میں حاضر ہوگا اور اس دوران درس کا وقت متعین کر دیا جائے تو وہ اجیر خاص کے حکم میں ہے لہٰذا ایک تو اجیر خاص کے احکام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، پھر مدرس عام دنیوی ملازمین کی طرح کوئی اجیر یا ملازم نہیں ہے جس کو صرف کام کرنے سے غرض ہوتا ہے بلکہ دین کی حفاظت اور نشر واشاعت بھی اس کے مقاصد میں سے ہونا چاہئے، نیز اہل مدرسہ نے اس پر اعتماد کر کے مقرر کیا ہے اور

---

[1] الأشباه والنظائر مع شرحه غمز عیون البصائر، کتاب الوقف، ج٢ص ٢٥٤.

طلبہ اس کے ماتحتی میں داخل ہیں، اس لئے مدرس کو چاہئے کہ وہ ان تمام باتوں کی رعایت رکھتا رہے، لہٰذا مدرس کی ذمہ داری ہے کہ:

۱۔ جو وقت حاضری کا مقرر کیا گیا ہے، اس میں پوری پابندی کے ساتھ حاضری کا ثبوت دے۔

۲۔ صرف حاضری دینا کافی نہیں ہے بلکہ مفوضہ خدمت انجام دینا بھی لازم ہے، حاضری دینے سے مقصود ہی کام کرنا ہوتا ہے اگر کوئی حاضر تو ہوتا ہے لیکن متعلقہ کام نہیں کرتا تو وہ حاضری شمار نہیں ہوگی۔

۳۔ اجیر خاص کے تنخواہ کا دار مدار مقررہ وقت میں حاضری دینے کے ساتھ ہے، جس حد تک حاضری ہوگی اس حد تک معاوضہ کا استحقاق ہوگا، اگر معمول سے زیادہ غیر حاضری ہوگی تو اس حد تک معاوضہ کا مستحق نہیں ہوگا۔

۴۔ اگر تقرری کے وقت تدریس کے علاوہ بھی کچھ ذمہ داری اس کے سر مقرر کی گئی تھی تو اس کو طے شدہ ترتیب کے مطابق انجام دینا ضروری ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

۵۔ مختلف مدرسین کی رعیت میں اپنے منصب کی حد تک طلبہ یا دیگر عملہ بھی داخل ہے، لہٰذا اپنی استطاعت کی حد تک اس کی مکمل نگہداشت رکھنا ضروری ہے۔

غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ

اجیر خاص ہو یا اجیر مشترک، دونوں کی تنخواہ کا دار مدار مقررہ اوقات میں حاضری دینے پر ہے اور غیر حاضری کے دنوں میں چونکہ اس نے حاضری نہیں دی اس لئے:

الف: ضابطہ کے لحاظ سے وہ اس حد تک مقررہ معاوضہ کا بھی مستحق نہیں ہے۔

"درِ مختار" میں ہے:

ولیس للخاص أن یعمل لغیره، ولو عمل نقص من أجرته بقدر ما عمل.[1]

ب: تاہم اگر تقرری کے وقت چھٹیوں کے متعلق کوئی ضابطہ طے پایاجائے کہ مثلاً ہر مدرس ہر مہینے میں تین دن چھٹی کر سکتا ہے اور اس کی تنخواہ بھی وضع نہیں ہو گی تو معاہدہ کے مطابق مدرس اگر غیر حاضری کرے گا تو اس کی تنخواہ وضع نہیں ہو گی بلکہ وہ مقررہ تنخواہ کا مستحق ہو گا۔

ج: اگر زبانی یا تحریری طور پر ایسا کوئی معاہدہ طے نہیں پایا تو بھی "المعروف کالمشروط" کے تحت عام دینی مدارس میں جس قدر چھٹیوں کی اجازت دینے کا تعامل ہو اور اس کی وجہ سے تنخواہ میں کٹوتی نہ ہوتی ہو تو اس حد تک چھٹی کرنے سے تنخواہ کا استحقاق باقی رہے گا۔

د: البتہ چونکہ معاملات میں صفائی وستھرائی مطلوب ہے اور اس طرح چھٹی کے متعلق ضابطہ طے نہ ہونا بعض صورتوں میں باہمی اختلاف ونزاع کا موجب بن جاتا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ تقرری کے وقت ہی ساری باتیں وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر طے کر دی جائیں تاکہ بعد میں پریشانی اور اختلاف کا موقع نہ ہو۔

حاضری سے محض مدرسہ کی حاضری مراد نہیں

حاضری سے مقصود یہ ہے کہ اجیر متعلقہ خدمت انجام دینے میں مصروف ہو یا اس کے لئے فارغ وتیار بیٹھا ہو کہ مستاجر چاہے تو کسی بھی وقت اس سے مقررہ خدمت

---

[1] الدر المختار مع حاشیة ابن عابدین، کتاب الإجارة،باب ضمان الأجیر،،ج٦ص٧٠.

لے سکے، اب اگر وہ خدمت کی جگہ میں حاضر تو ہے لیکن جو خدمت اس کے ذمہ لگائی جاتی ہے اس سے انکار کرتا ہے تو یہ حاضری کسی طرح کافی نہیں ہے اور محض اس کی بنیاد پر وہ تنخواہ کا مستحق نہیں ہوگا، لہٰذا اگر کوئی مدرس مدرسہ میں تو حاضر ہو لیکن تدریس کے مقررہ وقت میں بلاوجہ وہ درسگاہ نہیں جاتا اور درس نہیں دے رہا تو یہ حاضری کافی نہیں ہے بلکہ غیر حاضری کے مترادف ہے۔(عطرِ ہدایہ)

دورانِ درس ذاتی کام کرنا

حاضری کے متعلق اس ضابطہ سے واضح ہوا کہ اگر کوئی مدرس درس گاہ میں حاضر ہو جائے لیکن وہاں اپنی ذاتی کام میں وقت صرف کرے مثلاً موبائل پر طویل گفتگو کرتا رہے تو بھی چونکہ حاضری کا مقصود پورا نہیں ہوا اس لئے اس حد تک وقت کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوگا۔

مخیر مدرسین کی ایک کوتاہی

بعض مخیر مدرسین حضرات میں یہ معمول ہے کہ تقرری کے وقت ان کا معاوضہ مقرر کیا جاتا ہے لیکن چونکہ ان کو تنخواہ کی ضرورت نہیں ہوتی یا مدرسہ کے ساتھ احسان کرنا چاہتے ہیں اس لئے ملتے ہی سارا معاوضہ واپس مدرسہ کو صدقہ کر دیتے ہیں، یہ تو بڑی نیکی اور ہمت وعزیمت کی بات ہے لیکن ہوتا یوں ہے کہ اس کی وجہ سے بسا اوقات مدرس ضابطہ کے مطابق حاضری دینے کی پابندی نہیں کرتا یا تقرری کے وقت جو کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی جاتی ہے اس میں کوتاہی کی جاتی ہے۔

یہ رویہ شرعاً بالکل درست نہیں ہے بلکہ ذکر کردہ ضابطہ کے مطابق اگر عام معمول سے زیادہ غیر حاضری کرے گا اور پھر اس کی تنخواہ لے کر صدقہ کر دے گا تو استحقاق نہ ہونے کی وجہ سے غیر حاضری کی دنوں کا جو معاوضہ وصول کیا گیا، وہ اس کے ذمہ برقرار

رہے گا اور پھر نفلی صدقہ کی وجہ سے اس کا ذمہ فارغ نہیں ہوتا، گو صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا ان شاء اللہ۔

اگر صدقہ کے بجائے اس نیت سے رقم مدرسہ میں جمع کر دی جائے کہ جو کچھ مدرسہ کے حقوق و دیون دینے والے کے ذمہ ہیں، ان کی تلافی ہو جائے تو امید ہے کہ ذمہ سبکدوش ہو جائے گا، لیکن اس طرح کرنے سے بھی ادارے میں بد نظمی کا فروغ ہوتا ہے اس لئے اس سے بھی احتراز کر لینا چاہئے، اس کا آسان حل یہی ہے کہ تقرری کے وقت اپنی سہولت اور استطاعت کے بقدر ہی ذمہ داری قبول کی جائے تو ان باتوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

ایام غیر حاضری کی تلافی کا طریقہ

اگر کہیں مدرس سے اتنی غیر حاضری ہو جائے کہ سابقہ ضابطہ کے مطابق وہ معاوضہ کا مستحق نہیں تھا اور اس کے باوجود دانستہ یا نادانستہ پورا معاوضہ وصول کیا گیا، تو اب اس کی تلافی کا طریقہ کار یہ ہے کہ غیر حاضری کے دنوں کی بقدر جو معاوضہ وصول کیا گیا، اس کی بقدر رقم اسی نیت سے واپس مدرسہ میں جمع کر دے، اور بہتر یہ ہے کہ اس بات کی صراحت بھی کرے کہ غیر حاضری کی وجہ سے اس قدر تنخواہ کا میں مستحق نہیں تھا اس لئے واپس کرتا ہوں، لیکن اگر کسی وجہ سے اس طرح کہنا مشکل ہو یا مدرس کسی مصلحت کی وجہ سے اس پر آمادہ نہ ہوتا ہو تو کسی بھی عنوان سے رقم واپس کر دینا کافی ہے چاہے صدقہ وعطیہ کے نام سے دیدے یا تعاون واحسان کے عنوان سے۔

"در مختار" میں ہے:

(ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك) في البزازية غصب دراهم إنسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علمه برئ وكذا لو سلمه إليه بجهة

أخـرىٰ كهبـة أو إيـداع أو شراء وكـذا لـو أطعمـه فأكلـه خلافـا للشافعي زيلعي.[١]

تعلیمی دورانیہ میں حج وعمرہ یا تبلیغی چلہ پر جانا

اگر سال کی ابتداء میں کوئی مدرس مدرسہ کے ساتھ پورے سال کے لئے مدرسہ میں رہنے اور تدریس کی خدمت انجام دینے کا معاہدہ کرے تو اس معاہدہ کے بعد تعلیمی دورانیہ کے درمیان میں از خود نفلی حج، عمرہ یا تبلیغ کے لئے جانا درست نہیں ہے کیونکہ مدرس کا مدرسہ کے ساتھ عقد اجارہ کا تعلق ہے جو کہ عقدِ لازم ہے اور کوئی ایک فریق کسی معتبر عذر کے بغیر یکطرفہ طور پر اس کو ختم نہیں کر سکتا، البتہ مدرسہ کے ضابطہ کے تحت اس نوعیت کے کاموں کے لئے جانے کی گنجائش ہو اور وہ ضابطہ مدرسہ کی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہو تو گنجائش ہے۔ جہاں تک فرض حج کا تعلق ہے تو اس کی ادائیگی اگرچہ معتدبہ عذر ہے تاہم بد انتظامی سے بچنے کی خاطر ابتداء سال ہی میں اگر اس کی وضاحت کر لی جائے تو انسب ہے۔

جہاں تک اس مدت کی تنخواہ کا مسئلہ ہے تو اس میں وہی تفصیل ہے جو غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ کے ضمن میں ذکر کی جاچکی ہے کہ اصلاً تو ان دونوں کی تنخواہ کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا، تاہم اگر مدرسہ کے ضابطہ کے مطابق اس کی گنجائش ہو اور وہ ضابطہ مدرسہ کی مصالح کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہو تو اس کے مطابق تنخواہ لینا دینا جائز ہے۔

---

[١] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، ج٦ص ١٨٢.

مدرسہ کے مطبخ سے اساتذہ کو کھانا فراہم کرنا

۱۔اگر مدرسہ کا کھانا زکوۃ یا دیگر صدقات واجبہ کی رقوم سے تیار کیاجائے تو اس سے مدرسین یا دیگر ملازمین کو کھانا دینے کی اجازت نہیں۔

۲۔اگر نفلی صدقات وعطیات کی رقوم سے کھانا تیار کیاجائے یا صدقات واجبہ میں درست طریقہ سے تملیک شرعی کروانے کے بعد کھانا تیار کیاجائے تو ان دونوں صورتوں میں وہ کھانا مدرسہ کے دیگر املاک کی طرح ہے،لہٰذاایسا کھانا مدرسہ کے اساتذہ کرام کو قیمۃً فراہم کرناشرعاًدرست ہے۔

۳۔ قیمۃً کھانا فراہم کرنے میں بھی بہتر تو یہی ہے کہ عام بازاری قیمت کے مطابق فراہم کیاجائے کیونکہ عام حالات میں مدرسہ کی چیزوں میں تبرع واحسان کرناشرعاًممنوع ہے، تاہم اساتذہ کرام کی خدمات وسہولت کی پیشِ نظر اگر اس میں کچھ رعایت رکھی جائے تو بھی گنجائش ہے کیونکہ یہ بھی مصالح مدرسہ میں داخل ہے۔

مدرسہ کی طرف سے مدرسین کی دعوت کرنا

مدرسہ کے اموال کی حیثیت امانت کی ہوتی ہے،ارباب اہتمام کی ذمہ داری ہے کہ وہ شرعی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے تمام اموال کو اس کے واقعی مصارف ومصالح میں صرف کرنے کا اہتمام کرتے رہیں ،لہٰذا معاہدہ کے مطابق جن مدرسین کا کھانا مدرسہ کے ذمہ نہیں ہے،عام حالات میں مدرسہ کے فنڈ سے ان کے لئے دعوت کا انتظام کرنادرست نہیں، تاہم اگر دعوت کرنا مدرسہ کے مفاد میں ہو کہ مثلاً دعوت کی وجہ سے مدرسہ کے امور میں مزید دلچسپی پیدا ہو جائے اور اچھے سے اچھے انداز میں مدرسہ کے تعمیر وترقی میں اپنی صلاحیتیں صرف کرنا شروع کریں تو ایسی صورت میں ان کے لئے

دعوت کرنے کی گنجائش ہے تاہم اس میں بھی اعتدال کا خیال رکھنا ضروری ہے، غیر ضروری اخراجات مدرسہ کے اوپر ڈالنا شرعاً درست نہیں، "شامی" میں ہے:

إنما يحل للمتولي الإذن فيمايزيدبه الوقف خيرا.[1]

اساتذہ کے مکان میں بجلی و گیس فراہم کرنا

اساتذہ کرام کے مکانات میں اگر مدرسہ کی طرف سے بجلی و گیس فراہم کیاجائے یعنی بل کا خرچہ مدرسہ کے ذمہ ہو تو یہ شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں بھی اجرت کا حصہ قرار پائے گی جبکہ مہینہ کی شروع میں ان کی مقدار طے نہیں کی جاسکتی کہ کتنی بجلی یا گیس استعمال کی جائے گی، نیز بسااوقات یہ نزاع کا بھی موجب بن سکتا ہے اس لئے اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو اس کی جگہ تنخواہ میں اضافہ کیاجاسکتا ہے کہ مثلاً بل کے عنوان سے مقررہ تنخواہ میں کچھ مناسب اضافہ کردیاجائے۔

مختلف وجوہات کی وجہ سے مدرس کی تنخواہ سوخت کرنا

معاوضہ پر تدریس کرنے والا مدرس چونکہ اجیر ہے اس لئے معاہدہ کے مطابق جوں جوں وہ تدریس وغیرہ اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے گا یوں ہی وہ اس کے بقدر اجرت کا بھی مستحق ہوتا رہے گا، لہٰذا عمل کے بقدر تنخواہ کو سوخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے البتہ متعلقہ ذمہ داری / حاضری میں کوتاہی کی مقدار پر ضابطہ کے مطابق تنخواہ کی کٹوتی کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی مدرس حاضری کے مقررہ وقت سے مثلاً دس منٹ دیر سے آتا ہے، یا مہینہ میں ضابطہ سے زیادہ غیر حاضر رہتا ہے تو کوتاہی و غیر حاضری کے بقدر تنخواہ

---

[1] رد المحتار، كتاب الاجارة، باب مايجوز من الاجارة ومالايجوز، ج٦ص٣١.

کی کٹوتی کرنے میں تو مضائقہ نہیں ہے تاہم مکمل دن یا مکمل مہینہ کی تنخواہ سوخت کرنا جائز نہیں ہے، یوں ہی اگر مدرسہ کا ضابطہ ہے اور مدرس کو تقرری کے وقت بتایا گیا تھا کہ مدرسہ چھوڑنے کی صورت میں دو مہینہ پہلے اطلاع دے گا اور کوئی مدرس اس کی خلاف ورزی کرکے عین وقت استعفیٰ دیدے تو ایسا کرنا شرعی واخلاقی ہر لحاظ سے ناپسندیدہ ہے اور دینی اداروں میں بلا وجہ اس طرح معاہدات کی خلاف ورزیوں کی کسی طرح گنجائش نہیں ہونی چاہئے لیکن اس کی وجہ سے ان دنوں / مہینوں کی تنخواہ سوخت کرنا جائز نہیں ہے جن میں مدرس نے معاہدہ کے مطابق ذمہ داری پوری کی ہے۔

البتہ اگر شروع ہی سے یہ ضابطہ بنایا جائے کہ جو مدرس مثلاً مقررہ وقت سے دس منٹ دیر سے حاضر ہو گا، اس کے ساتھ مدرسہ کا اس دن کوئی عقد نہیں ہو گا اور اس دن وہ مدرسہ کا اجیر نہیں ہو گا تو اس صورت میں اس دن کی تنخواہ کا مدرس مستحق نہیں ہو گا گو وہ عملی طور پر تدریس بھی کرے۔

مدرس کے ساتھ مالی تعاون کرنا / قرض دینا

مدرسہ کا مال چونکہ مدرسہ کے مصالح ہی کے لئے مختص ہوتا ہے اس لئے عام حالات میں یہ مال کسی کو قرض دینا درست نہیں ہے البتہ مدرسہ کی مصلحت کے پیش نظر بعض صورتوں میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے کچھ شرائط وپابندیاں ہیں، یوں ہی کسی کو تبرع واحسان کے طور پر بھی دینا شرعاً جائز نہیں کیونکہ اوقاف کے مال میں تبرع کرنے کی گنجائش نہیں۔

"جامع الفصولین" میں ہے:

"فصط خ": ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله ولا إقراضه فلو أقرض ضمن وكذا المستقرض وذكر ان

القيم لو أقرض مال المسجد ليأخذه عند الحاجة وهو أحرز من إمساكه فلا بأس به. "عده": يسع المتولي إقراض ما فضل من غلة الوقف لو أحرز.[1]

قرض دینے کے متعلق ایک تجویز

البتہ موجودہ حالت میں یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کیونکہ دینی مدارس کی تنخواہیں کافی کم ہوتی ہیں اور بعض اوقات کسی مدرس یا مدرسہ کے ملازم کو خوشی و غمی وغیرہ مواقع پر فوری رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر موقع پر لوگوں سے قرض لیتے پھرنا مناسب بھی نہیں ہوتا اور عموماً مفید بھی نہیں ہوتا، اور مدرسہ کی خدمت کے ساتھ ساتھ کوئی کاروبار جاری رکھنا بھی ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے میسر نہیں ہوتا، اس لئے بسا اوقات غمخواری اور خیر سگالی کے جذبہ کے تحت مدرسہ کے مال ہی سے قرض اور بعض اوقات تبرع و احسان کا معاملہ کیا جاتا ہے حالانکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ بات بھی قابل اشکال ہے، اس لئے اس کی مناسب اور سہل حل یہ ہے کہ قرضہ فنڈ یا صوابدید فنڈ کے نام سے ایک مستقل مد قائم کیا جائے اور ساتھ اس کے ضوابط بھی مقرر کئے جائیں، پھر اسی نام سے چندہ کیا جائے اور اسی فنڈ سے ایسی ضروریات پوری کی جائیں۔

* *

[1] جامع الفصولين،الفصل السابع والعشرون في تصرفات الأب والوصي والقاضي و المتولي،ج ٢ص١٠. راجع للتفصيل الدر المختار وحاشية ابن عابدين، ج٥ص ٤١٧.والبحر الرائق ،ج٥ ص ٢٥٩.

باب چہارم:

- ○ طلبہ سے متعلق احکام
- ○ مدرسہ سے متعلق طلبہ کی ذمہ داریاں
- ○ طلبہ کو جانی یا مالی سزا دینا
- ○ طلبہ کو داخل یا خارج کرنا
- ○ طلبہ سے جانی یا مالی خدمت و تعاون لینا

طلبہ سے متعلق ذمہ داریوں کی اصل بنیاد

طلبہ سے متعلق جن مسائل واحکام کا تعلق ارباب اہتمام وانتظام کے ساتھ ہے، ان کی بنیاد اس بات پر ہے کہ طلبہ بلاشبہ ذمہ داراں مدرسہ کے رعیت میں داخل ہیں جن کی خیر خواہی کی ذمہ داری ارباب مدرسہ میں سے ہر شخص پر اس کی استطاعت اور اختیارات کی حد تک عائد ہوتی ہے اور طلبہ کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی دینی تعلیم و تعلم اور اخلاقی تہذیب وتربیت میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ چھوڑی جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے طلبہ سے متعلق ان دونوں امور پر بھرپور توجہ صرف کی جائے، اگر کوئی شخص یا ادارہ اپنے اختیارات واستطاعت کے باوجود ان دونوں ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے تو یہ اس فرض منصبی میں غفلت کے مترادف ہے جس کی مسئولیت راعی اور اربابِ اختیار کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے اور ارباب اختیار کو اس کا مکلف بنایا گیا ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک اس کا لحاظ رکھے۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، أنه: سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: كلكم راع ومسئول عن رعيته، فالإمام راع وهو مسئول عن رعيته، والرجل في أهله راع وهو مسئول عن رعيته، والمرأة في بيت زوجها راعية وهي مسئولة عن رعيتها، والخادم في مال سيده راع وهو مسئول عن رعيته.[١]

---

[١] صحيح البخاري، باب: العبد راع في مال سيده، ولا يعمل إلا بإذنه،رقم الحديث:٢٤٠٩.

طلبہ سے متعلق ایک زریں وصیت

طلبہ کے حوالہ سے ذمہ داریوں کے متعلق ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بعض روایات کے مطابق خود حضور ﷺ نے دینی علوم کے طالبین سے متعلق معلمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ وہ ان کے خیر و بھلائی کا لحاظ رکھیں، چنانچہ ابی ہارون عبدی روایت کرتے ہیں کہ ہم جب حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں حاضر ہو جاتے تو آپ ہمیں خوش آمدید کہتے اور پھر یہ حدیث سناتے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے پاس مشرق کی طرف سے کچھ لوگ سیکھنے کے لئے آئیں گے تو جب وہ آپ کے ہاں آجائیں تو ان کے متعلق خیر و بھلائی کی وصیت قبول کرو"۔

چنانچہ "سنن ترمذی" میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: يأتيكم رجال من قبل المشرق يتعلمون، فإذا جاءوكم فاستوصوا بهم خيرا» قال: فكان أبو سعيد، إذا رآنا قال: مرحبا بوصية رسول الله صلى الله عليه وسلم.[1]

ابی ہارون عبدی کی وجہ سے اگر چہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے اور بعض محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا، تاہم امام بیہقی رحمہ اللہ نے یہی بات ابی ہارون عبدی کے علاوہ ابی نضرہ سے بھی نقل فرمائی ہے، لہذا وہ روایت اس کا شاہد و موید ہے جس کے بعد اس روایت کو بالکل بے اصل قرار دینا مشکل ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن الترمذي ت شاكر، باب ما جاء في الاستيصاء بمن يطلب العلم، رقم الحديث: ٢٦٥١.

هكذا رواه جماعة من الأئمة عن أبي هارون العبدي، وأبـو هـارون وإن كان ضعيفا فرواية أبي نضرة له شاهدة.[1]

چنانچہ بہت سے سلف کا یہی معمول تھا کہ جب ان کے پاس دین کا طالب علم پہنچتا تو وہ یہی وصیت دہرا کر اس کو خوش آمدید کہتے تھے۔[2]

یہاں روایت میں طلبہ کے بارے میں "خیر" کی وصیت فرمائی گئی، اس میں صرف ظاہری علوم وفنون کی تعلیم دینا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ ان کی اخلاقی تربیت و تہذیب بھی اس میں داخل ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(فاستوصوا بهم خيرا) أي: في تعليمهم علوم الدين وأخلاق المهتدين كما قيل في الحديث القدسي لداود عليه الصلاة والسلام: «إذا رأيت لي طالبا فكن له خادما» .[3]

بلکہ ایک روایت میں، جس کو علامہ طبرانی رحمہ اللہ نے "مکارم الاخلاق" میں روایت کیا ہے، تو یہاں تک ذکر فرمایا گیا کہ اخلاق حسنہ سے بڑھ کو کوئی خیر انسان کو نصیب نہیں ہوتا۔

عن أسامة بن شريك قال:قالوا:يا رسول الله ما خير ما أعطي الناس؟قال:إن الناس لم يعطوا شيئا خيرا من خلق حسن[1]

---

[1] المدخل إلى السنن الكبرى، باب تقريب الفتيان من طلاب العلم وترغيبهم في التعلم،ج١ص ٣٦٩.

[2] التيسير بشرح الجامع الصغير،ج١ص٣٠٣.

[3] مرقاة المفاتيح ،كتاب العلم،ج١ص ٢٩٩.

لہٰذا "خیر" کے عموم میں اخلاقی تہذیب وتربیت داخل ہے۔[1]

علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومنه أخذ أنه ينبغي أن يكون الطالب عنده أعز الناس عليه وأقرب من أهله إليه ولذلك كان علماء السلف يلقون شبك الإجتهاد لصيد طالب ينفع الناس في حياتهم وبعدهم وأن يتواضع مع طلبته ويرحب بهم عند إقبالهم عليه ويكرمهم ويؤنسهم بسؤاله عن أحوالهم ويعاملهم بطلاقة وجه وظهور بشر وحسن ود ويزيد في ذلك لمن يرجئ فلاحه ويظهر صلاحه ومن ظهرت أهليته من ذوي البيوت ونحوهم.[2]

مسجد میں طلبہ کا قیام

مسافر طلبہ کے لئے مسجد کے حصہ میں قیام کرنا گو ناجائز نہیں ہے لیکن ایسا کرنا بوجوہ مناسب نہیں ہے جس میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسجد بہت احترام وتقدّس کی جگہ ہے، شریعت نے اس کے لئے مختلف احکام وآداب متعین فرمائے ہے جبکہ مستقل قیام کرنے یا زیادہ وقت گزارنے کے بعد عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ احترام وتقدس کی وہ کیفیت دل میں برقرار نہیں رہتی جس کی وجہ سے بسا اوقات آداب میں کوتاہی عمل میں آجاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ضروری احکام ومسائل میں بھی غفلت ہونا

---

[1] مكارم الأخلاق للطبراني،باب ما جاء في حسن الخلق،ج١ص٣١٦.

[2] فيض القدير،حرف الهمزة،ج٢ص٤٠٠.

شروع ہوجاتاہے۔ اسی لئے بہت سے فقہاء کرام نے حرمین شریفین میں (مستقل)مجاورت کومکروہ قرار دیاہے۔"شامی"میں ہے:

والمجاورة بمكة مكروهة أي عنده خلافا لهما، وبقوله قال الخائفون المحتاطون من العلماء كما في الإحياء، قال ولا يظن أن كراهة القيام تناقض فضل البقعة لأن هذه الكراهة علتها ضعف الخلق وقصورهم عن القيام بحق الموضع. قال في الفتح. وعلى هذا فيجب كون الجوار في المدينة المشرفة كذلك يعني مكروها عنده.[۱]

اس لئے اوّلاً تو مسجد کے بجائے مدرسہ میں قیام گاہ کا انتظام کرلینا چاہئے، اگر کہیں ایسی سہولت میسر نہ ہو تواگر ممکن ہو تو عین مسجد، یعنی جو جگہ نماز پڑھنے کے لئے مختص ہو، وہاں قیام کرنے کے بجائے مسجد سے ملحقہ زمین،وضوء خانہ وغیرہ کے اوپر رہائش گاہ کاانتظام کیاجائے۔

مسجد میں جنابت لاحق ہونا

جنابت کی حالت میں جس طرح مسجد میں داخل ہوناجائز نہیں ہے یوں ہی مسجد کے اندر ٹھہرنا بھی جائز نہیں ہے، اس لئے جنابت لاحق ہوجانے کے فوراً بعد مسجد کے احاطہ سے نکلناضروری ہے۔بعض اہل علم کے نزدیک نکلنے سے پہلے تیمم کرے پھر نکلے جبکہ دیگر اہل علم کے نزدیک ایساکرناضروری نہیں ہے۔البتہ اگر سخت سردی ہو اور گرم پانی مہیانہ ہو جس کی وجہ سے جنابت کے فوراً بعد نہانا ناقابل برداشت تکلیف

---

[۱] حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الحجّ، مطلب في حكم المجاورة بمكة والمدينة،ج٢ص٥٢٤.

یا بیماری کا باعث ہو اور یہ صرف وہم وگمان ہی نہ ہو بلکہ یقین یا کم از کم غالب گمان اور تجربہ ہو تو ایسی صورت میں بھی شرعی مسجد کے احاطہ سے نکلنا ضروری ہے، اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو کہ مثلاً باہر کوئی ایسی جگہ نہ ہو جہاں وہ سردی کی شدت سے جان بچاسکے تو اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ تیمم کرکے مسجد میں رہے اور جب نہانے کا انتظام ہو جائے ، فوراً نکلے۔ "بدائع" میں ہے:

ولا يباح للجنب دخول المسجد، وإن احتاج إلى ذلك يتيمم، ويدخل سواء كان الدخول لقصد المكث أو للاجتياز عندنا.[1]

"بنایہ" میں ہے:

ولو احتلم في المسجد وأمكنه الخروج من ساعته يخرج ويغتسل، وقيل يتيمم ويخرج وإن لم يمكنه الخروج بأن كان في وسط الليل فيستحب له التيمم حتى لا يبقى جنبا.[2]

"بحر" میں ہے:

وفي منية المصلي، وإن احتلم في المسجد تيمم للخروج إذا لم يخف، وإن خاف يجلس مع التيمم ولا يصلي ولا يقرأ اه.وصرح في الذخيرة أن هذا التيمم مستحب وظاهر ما قدمناه في التيمم عن المحيط أنه واجب، ثم الظاهر أن المراد بالخوف الخوف من لحوق ضرر به بدنا أو مالا كأن يكون ليلا.[3]

---

[1] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،كتاب الطهارة،١ص٣٨.

[2] البناية شرح الهداية،كتاب الطهارة،ج١ص٣٣٢.

[3] البحر الرائق، كتاب الطهارة،ج١ص٢٠٦.

طلبہ سے ذاتی کام لینا

الف: جو طلبہ نابالغ ہوں، ان سے اپنی ذاتی خدمت لینا درست نہیں ہے اگر وہ بخوشی ورضامندی بھی کرنا چاہے تو بھی ان کی رضامندی کا شرعاً اعتبار نہیں ہے، البتہ ان کی تربیت کے پیش نظر مدرسہ کے اندر کچھ چھوٹے موٹے کام ان سے لئے جاسکتے ہیں جو ان کے لئے قابلِ تحمل ہو اوراس سے ان کے تعلیم وسبق میں خلل نہ آئے۔

ب: بالغ طلبہ کے متعلق بھی احتیاط یہی ہے کہ اپنی کوئی ذاتی خدمت ان سے نہ لی جائے، تاہم اگر:

ا۔ وہ دلی رضامندی سے کسی استاذ کا کوئی کام کرنا چاہے۔

۲۔ استاد کو بھی اطمینان ہو کہ وہ واقعۃً دلی خوشی سے کام کرنا چاہتے ہیں، محض شرما شرمی یا احسان و دباؤ کی خاطر آمادہ نہیں ہو رہے جیسا کہ عموماً ایسا ہوتا ہے۔

۳۔ کام کی نوعیت بھی ایسی ہو کہ اس کی وجہ سے طلبہ کی تعلیم میں حرج واقع نہ ہوتا ہو۔

ان باتوں کی رعایت رکھتے ہوئے ان سے خدمت لینے کی گنجائش ہے، اور اس صورت میں بھی بہتر اور احوط صورت یہی ہے کہ کام وخدمت کی مناسبت سے کچھ معاوضہ ان کو کسی نہ کسی عنوان سے دیا جائے۔

طلبہ کی طرف سے دعوت کھانا

بعض مدارس میں امتحان، دستاربندی اور فراغت کے موقع پر طلبہ اپنے اساتذہ کے لئے دعوت کا انتظام کرتے ہیں، عام طور پر یہ دعوتیں محبت وتعظیم کے جذبہ کے تحت ہوتی ہیں جو کہ نہایت مستحسن بلکہ طلبہ کے لئے اپنے معلمین کے ساتھ ایسا جذبہ ایک حد تک ضروری اور ان کی تعلیم وترقی کی راہ میں بڑا کارآمد ہے، تاہم یہاں بھی اس بات کا اطمینان کرنا ضروری ہے کہ:

الف: طلبہ اپنی رغبت واختیار سے دعوت کریں، مدرسہ یا معلم کی طرف سے مطالبہ ودباؤ وغیرہ کے تحت چاروناچار دعوت کرنے پر مجبور نہ ہوں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت والے دعوت کرتے ہیں تو دوسری جماعت کو طعنہ سامنا ہے کبھی تو زبان سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات زبان سے تو کچھ نہیں کہا جاتا، لیکن معلم یا مدرسہ کی طرف سے عملی برتاؤ ایسا کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں طلبہ اپنے آپ کو اخلاقی طور پر دعوت کرنے پر مجبور خیال کرنے لگتے ہیں، ایسی دعوتوں کے قبول کرنے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

ب: جن پیسوں سے دعوت کا انتظام کیا جاتا ہو، اس کو جمع کرنے میں کوئی منکر نہ ہو کہ مثلاً فی طالب علم کچھ پیسے جبری طور پر مقرر کئے جائیں۔

ج: جمع کرنے والوں میں کوئی نابالغ طالب علم شامل نہ ہو۔

اگر ان باتوں میں کوتاہی برتی جائے تو ایسی دعوت قبول کرنا درست نہیں ہے۔

طالب علم سے ہدیہ وصول کرنا

اس سے ہدیہ / تحفہ وصول کرنے کا حکم بھی معلوم ہوا، وہ یہ ہے کہ:

الف: طالب علم عاقل وبالغ ہو۔ ب: وہ اپنی دلی خوشی کے ساتھ کچھ ہدیہ دینا چاہے۔ ۳: یہ خطرہ نہ ہو کہ استاد صاحب ہدیہ قبول کرنے کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی میں بے جا رعایت سے کام لینا شروع کریں گے، تو اس صورت میں ہدیہ قبول کرنا نہ صرف جائز بلکہ دینے والے کی دل جوئی وغیرہ کوئی نیک ہدف مقصود ہو، تو مندوب اور مستحسن ہے، اور اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو اس کا لینا درست نہیں ہے۔

طالب علم دلی خوشی سے ہدیہ دیتا ہے یا شرما شرمی وغیرہ عوارض کی وجہ سے؟ اس بات کو معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، بعض محتاط بزرگوں کا عمل یہ رہا ہے کہ اگر

کوئی طالب علم از خود اپنی طرف سے کوئی چیز لا کر پیش کرتا ہے تو اس کو قبول کرتے ہیں اور اگر یہ طالب علم کے ساتھ کسی ضرورت کا اظہار کرے یا مثال کے طور پر اس کو کسی چیز کی خریداری بھیج دیں اور پھر وہ استاد صاحب سے رقم ہی وصول نہ کرنا چاہے، تو ایسی صورت میں وہ اس کو دلی رضامندی کے خلاف گمان کرتے ہیں اور پہلی صورت میں تو ہدیہ قبول ہی نہیں کرتے جبکہ دوسری صورت میں بہر حال رقم دیدیتے ہیں۔

مالی جرمانہ لینا

سبق میں ناغہ کرنے، دیر سے آنے، سبق یاد نہ کرنے یا امتحان میں کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات طلبہ پر مالی جرمانہ مقرر کیا جاتا ہے، بعض اہلِ علم کے نزدیک فی نفسہ اس میں مضائقہ نہیں، تاہم اکثر اہلِ علم کے نزدیک مالی جرمانہ مقرر کرنا شرعاً درست نہیں ہے اس لئے اس سے گریز کرنا چاہئے خصوصاً مدارس میں تو بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے، اگر کہیں ضرورت محسوس ہو تو مالی جرمانہ کے بجائے کوئی جائز متبادل صورت اختیار کی جائے، مثلاً:

الف: ایسے طالب علم کا داخلہ ختم کیا جائے اور آئندہ داخلہ کے لئے کوئی فیس مقرر کی جائے۔

ب: جرم کو دیکھتے ہوئے کچھ وقت تک مدرسہ کی طرف سے اس کا کھانا بند کیا جائے۔

ج: عام طلبہ کی بنسبت اس کو دیر تک پڑھنے کا پابند بنایا جائے۔

د: اس سے مدرسہ کی کوئی خدمت مثلاً مسجد کی صفائی وغیرہ لی جائے، وغیرہ۔

طلبہ کو جسمانی سزا دینا

اس مسئلہ کے متعلق عموماً کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، بعض لوگ تو اس کو بالکل ناجائز کہتے ہیں اور دوسری طرف اکثر لوگ اس میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور

جواز کی آڑ لیکر شرعی حدود وقیود کو پامال کر جاتے ہیں، حالانکہ بچوں اور طلبہ کو مارنا نہ تو بالکل حرام وناجائز ہے نہ ہی کسی ولی یا استاذ کو کھلی چھوٹ حاصل ہے کہ جو اور جس طرح چاہے، سزا دے بلکہ اس میں مندرجہ ذیل باتوں کی رعایت رکھ لینی چاہئے:

الف۔ معلم کے لئے متعلم کو جسمانی سزا اگرچہ جائز ہے لیکن عام حالات میں کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اس لئے اس کے بجائے زبانی نصیحت، ڈراؤ دھمکاؤ وغیرہ کوئی مناسب صورت اختیار کر لینی چاہئے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت نقل فرمائی ہے کہ:

عن عطاء، عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: علموا ولا تعنفوا فإن المعلم خير من المعنف[1].

ب۔ نابالغ متعلم کو مارنے کے لئے اس کے ولی کی اجازت بھی ضروری ہے چاہے وہ صراحۃً یعنی زبان سے اجازت دیدے یا دلالۃً اجازت ہو کہ مثلاً اس کو معلوم بھی ہو کہ فلاں مدرسہ میں قانون کی خلاف ورزی یا سبق یاد نہ کرنے پر طلبہ کو سزا دی جاتی ہے اور یہ جانتے ہوئے اس نے اپنا بچہ وہاں داخل کیا۔

ج۔ مارنے سے پہلے جرم کی تحقیق کر لی جائے کہ واقعۃً اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے یا کسی نے غلط شکایت لگائی؟ نیز جس چیز کو معلم جرم سمجھتا ہے وہ واقعۃً اس بچے کی بنسبت جرم ہے بھی یا نہیں؟

د۔ تدریج سے کام لیا جائے کہ اولاً پیار ونصیحت سے کام لیا جائے، اگر ایسا کرنا مفید ثابت نہ ہو تو زبانی ترغیب وتشویق یا ڈراؤ ودھمکاؤ کا راستہ اختیار کیا جائے، اگر اس سے بھی کام نہ

---

[1] المدخل إلى السنن الكبرى للبيهقي، باب تقريب الفتيان من طلاب العلم وترغيبهم في التعلم، ص: ٣٧٠.

چلے تو طلبہ کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کی جائے، اگر یہ بھی کارگر نہ ہوا تو کان پکڑے یا ہلکی پھلکی سزا بھی دیدے، اگر اس آخری تیر سے بھی بچہ نہیں سدھرتا، تب جاکر بڑی سزا دی جائے۔

علامہ عزالدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومهما حصل التأديب بالأخف من الأفعال والأقوال والحبس والاعتقاد، لم يعدل إلى الأغلظ إذ هو مفسدة لا فائدة فيه؛ لحصول الغرض بما دونه.

س۔ مارتے ہوئے بھی تادیب و تہذیب کی نیت سے مارے، انتقام یا دلی بھڑاس نکالنے کے لئے نہ مارے، لہٰذا غصہ کی حالت میں مارنے سے احتراز کرنا ضروری ہے کہ غصہ کی حالت میں طبعی اعتدال نہ ہونے کی وجہ سے مارنے میں عملی اعتدال کا پہلو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔

ص۔ اتنی سخت سزا نہ دی جائے جس سے ہڈی ٹوٹے، اعضاء تلف ہوجانے یا دیگر قویٰ ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہو، اسی لئے فقہاء حنفیہ نے تین سے زیادہ بار مارنے کو ممنوع قرار دیا اور یہی سے معلوم ہوا کہ نازک اعضاء پر مارنا، کسی مہلک چیز سے مارنا، بھی درست نہیں ہے۔

شامی میں ہے:

لا يجوز ضرب ولد الحر بأمر أبيه، أما المعلم فله ضربه لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحته، والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة التعليم، وقيده الطرسوسي بأن يكون بغير آلة جارحة، وبأن لا يزيد على ثلاث ضربات ورده الناظم بأنه لا وجه

له، ويحتاج إلى نقل وأقره الشارح قال الشرنبلالي: والنقل في كتاب الصلاة يضرب الصغير باليد لا بالخشبة، ولا يزيد على ثلاث ضربات ونقل الشارح عن الناظم أنه قال: ينبغي أن يستثنى من الأحرار القاضي، فإنه لو أمره بضرب ابنه جاز له أن يضربه بل لا يجوز له أن لا يقبل اهـ وقيده الشرنبلالي بكون القاضي عادلا، وبمشاهدة الحجة الملزمة.[١]

بچوں کے مار پٹائی میں ان حدود وقیود کی پابندی کرنا ضروری ہے، بات بات پر بچوں اور طلبہ کو مارنے کی عادت بنالینا، یا حد سے زیادہ مارنا یوں ہی تربیتی لحاظ سے کچھ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتا، علامہ مصطفی سباعی رحمہ اللہ اپنا تجربہ زندگانی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لا تستعمل الضرب في تأديب ولدك إلا حين تخفق الموعظة والتأنيب، وليكن ضربك له ضرب تربية لا ضرب انتقام، وتجنَّب ضربه وأنت شديد الغضب منه، واحذر موطن الأذى من جسمه، وأشعره وأنت تضربه أنك لا تزال تحبُّه. وقلل ما استطعت من استعمال الضرب وسيلة للتأديب. ولأن يهابك ويحبك خير من أن يخافك ويكرهك.[٢]

---

[١] حاشية ابن عابدين على الدر المختار،قبيل كتاب إحياء الموات،ج٦ص٤٣٠.

[٢] هكذا علمتني الحياة، ضرب الأولاد ،ص١٢٦.

طلبہ کے چھوڑے ہوئے سامان کا حکم

تعطیلات سے پہلے ہی ارباب انتظام کو طلبہ میں اس بات کا اعلان کرنا چاہئے کہ ہر طالب علم اپنا ذاتی سامان لے کر جائے، اگر کوئی طالب علم سامان چھوڑ کر جاتا ہے تو وہ یا تو مدرسہ کی ملک کر کے جائے یا کم از کم اس کے مصرف کی تعیین کرے، لیکن اگر کہیں ایسا اعلان نہ ہوا اور طلبہ کمروں میں کچھ سامان چھوڑ کر چلے گئے اور آئندہ سال بھی مدرسہ نہیں آئے، تو جو کچھ سامان چھوڑا گیا ہے اس کی حیثیت شرعاً مال لقطہ کی ہے، لہذا:

الف: کوئی چھوٹی موٹی کم قیمت چیز ہو، مثلاً پیالی، معمولی برتن وغیرہ چیزیں، جن کی کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی اور یہ گمان نہیں ہوتا کہ مالک اس کو لینے اور اس کا مطالبہ کرنے آئے گا، یا یہ خیال ہو کہ مالک نے مباح کر کے چھوڑ دیا ہو کہ جو چاہے اٹھائے، ان جیسی چیزوں کا حکم یہ ہے کہ جو آدمی اس کو پائے گا وہ اس کو استعمال کر سکتا ہے۔

ب: دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جو خاطر خواہ قیمت کی ہوتی ہیں، اس کا حکم یہ ہے کہ ارباب انتظام یا طلبہ کے لئے ان اشیاء کا استعمال درست نہیں ہے بلکہ دفتر یا طلبہ وغیرہ کے ذریعے اصل مالک کی تفتیش کی جائے اور اس تک چیز پہنچانے کی کوشش کی جائے یا اس کے اجازت لیکر استعمال کرے، اگر کسی طرح مالک معلوم نہ ہو سکے تو فقیر طلبہ کو یہ چیز اس کی طرف سے صدقہ کے طور پر دیدی جائے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

> ثم ما يجده الرجل نوعان: نوع يعلم أن صاحبه لا يطلبه كالنوىٰ في مواضع متفرقة وقشور الرمان في مواضع متفرقة، وفي هذا الوجه له أن يأخذها وينتفع بها إلا أن صاحبها إذا وجدها في يده بعد ما جمعها فله أن يأخذها ولا تصير ملكا للآخذ..ونوع آخر يعلم أن

صاحبه يطلبه كالذهب والفضة وسائر العروض وأشباهها وفي هذا الوجه له أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتى يوصلها إلى صاحبها. إذا مرّ في أيام الصيف بثمار ساقطة تحت الأشجار فهذه المسألة على وجوه إن كان ذلك في الأمصار لا يسعه التناول منها إلا أن يعلم أن صاحبها قد أباح ذلك إما نصا أو دلالة بالعادة، وإن كان في الحائط والثمار مما يبقى كالجوز ونحوه لا يسعه أن يأخذه ما لم يعلم أن صاحبها قد أباح ذلك، ومنهم من قال: لا بأس به ما لم يعلم النهي إما صريحا أو دلالة، وهو المختار[١]

طلبہ سے جسمانی خدمت لینا

جسمانی خدمت سے مراد مثلاً سر کا مالش کرنا، ہاتھ پیر دبانا وغیرہ، اگر کوئی طالب علم امرد یانابالغ ہے تو اس سے ایسی خدمت لینے سے احتراز کرتے رہنا چاہئے کہ یہ بہت سے مفاسد کا ذریعہ ہے، علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد أفتى الشيخ محيي الدين النووي بمنع النظر إليه سواء كان بشهوة أو بغير شهوة. وبعضهم فصلوا فقالوا: إن كان بشهوة لا يباح وإن كان بغير شهوة فلا بأس. قلت: الأولى في هذا الزمان أن يفتي بقول الشيخ محيي الدين لظهور الفسق والشناعة بين الناس. وذكر في " فتاوى الإمام ناصر الحسامي - رَحِمَهُ اللهُ - ": الغلام إذا

---

[١] الفتاوى الهندية، كتاب اللقطة، ج٢ص٢٩٠.

بلغ مبلغ الرجال ولم يكن صبيحا فحكمه حكم الرجال وإن كان صبيحا فحكمه حكم النساء وهو عورة من قرنه إلى قدمه.[1]

بالغ طلبہ اگر اپنی مرضی سے ایسی خدمت کرنا چاہے تو جائز ہے جب کہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور اس سے تعلیم وتربیت میں حرج نہ ہوتا ہے، البتہ ران کو کپڑے کے اوپر سے دبانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، اس لئے عام حالات میں اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔

"محیط" میں ہے:

في «فتاوىٰ أهل سمرقند» قال الفقيه أبو جعفر: سمعت الشيخ أبا بكر يقول: لا بأس بأن يغمز الرجل الرجل إلى الساق، ويكره أن يغمر الفخذ ويلمسه من وراء ثوب أو غيره، قال الفقيه أبو جعفر: ونحن نبيح هذا، ولا بأس به، قال الفقيه أبو جعفر: وكان الشيخ أبو بكر يقول: يغمز الرجل رجل والديه، ولا يغمز فخذ والديه.[2]

طالبِ علم کا مدرسہ سے اخراج کرنا

قرآن کریم میں حضور ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ جو لوگ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ کی رضاء حاصل کرنا چاہتے ہیں، آپ ان کو اپنے سے دور نہ کرو، سورۃ انعام میں ہے:

---

[1] البناية شرح الهداية، كتاب الكراهية، فصل في الوطء والنظر واللمس، ج١٢ص١٣٤.

[2] المحيط البرهاني، كتاب الإستحسان والكراهية، الفصل الثاني والثلاثون في المتفرقات، ج٥ ص٣٩٩.

{ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ} [الأنعام : ٥٢]

ترجمہ: اور جو لوگ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کر جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں تیرے ذمہ ان کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ تیرا کوئی حساب ان کے ذمہ اگر تونے انہیں دوہٹایا پس تو بے انصافوں میں سے ہو گا۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام کی کافر قوم نے جب ان کو یہ الزام دیا کہ آپ کی اتباع کرنے والے ہم میں سے رذیل ترین لوگ ہیں، تو آپ نے جواب میں یہ واضح اعلان فرمایا کہ:

"{وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا } [هود : ٢٩]"اور"{ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ} [الشعراء : ١١٤]"

ترجمہ: اور میں ایمان والوں کو دور کرنے والا نہیں ہوں۔

ان آیات سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سنت اوران کا طریقہ کار واضح ہوتا ہے کہ جو مؤمن صادق ان کے پاس آکر ملتاہے، دنیوی لحاظ اور ظاہری سطح سے وہ کتنا ہی خستہ حال اور تنگدست کیوں نہ ہو، لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اس کو اپنے سے دھتکارتے اور دور نہیں کرتے بلکہ قرآن کریم نے تو(بلاوجہ) ایسے دھتکارنے کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔

دینی مدارس کے طلبہ جو دینی ،ایمانی واخلاقی علوم وتربیت حاصل کرنے کی خاطر مدرسہ آتے ہیں وہ بلاشبہ مومنین ہیں اور ان آیات کے عموم میں داخل ہیں بلکہ عام مومنین کی بنسبت ان کی امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ دنیوی مال ومتاع سے کنارہ

کش ہو کر صرف اور صرف علمِ دین حاصل کرنے آتے ہیں گویا اپنے آپ کو اسی کام کے لئے وقف کرر کھا ہے، لہٰذا بلا وجہ ان کو مدرسہ سے خارج کرنا خلاف سنت بلکہ درج بالا اصطلاح کے مطابق ظلم ہے، خاص کر جہاں دیگر مدارس موجود نہ ہوں۔

اگر کسی طالب علم سے کوئی شکایت ملے اور تفتیش سے اس کا درست ہونا بھی معلوم ہو جائے تو اخراج کے علاوہ دیگر ذرائع سے اس کی اصلاح کی مکمل کوشش کر لینی چاہیئے، تاہم اگر کسی طرح اصلاح نہ ہو سکے یا ارباب اہتمام سمجھتے ہیں کہ اس کو مدرسہ میں بر قرار رکھنا خود اس کے لئے یا دیگر طلبہ کے حق میں مضر ہے تو ایسی صورت میں زجراً اس کے اخراج کرنے میں مضائقہ نہیں ہے چنانچہ کئی محقق مفسرین نے حضرت موسی وخضر علیہما السلام کے واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ جہاں استاد وشاگرد میں نبھاؤنہ ہو سکے وہاں مناسب طریقہ سے استاد کا معذرت کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ:

{هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا}

[الکہف : ۷۸]

ترجمہ: کہا اب میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے اب میں تجھے ان باتوں کا راز بتاتا ہوں جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

مدرسہ کی چیز ضائع کرنے پر تاوان لینا

مدرسہ کی چیزیں وقف یا مملوک وقف ہوتی ہیں، طلبہ اور مدرسین وغیرہ کو اس کے استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن یہ اجازت غیر محدود نہیں ہے کہ جیسا چاہیں استعمال کریں، بلکہ امانت کی چیز کی طرح محتاط اور جائز طور پر استعمال ہونا چاہیئے، لہٰذا اگر

ناجائز استعمال یا تعدّی وکوتاہی سے استعمال کرنے کی صورت میں اگر کوئی چیز ضائع ہوجائے تو اس کا ضمان مدرسہ میں جمع کرنالازم ہے، "مجمع الضمانات" میں ہے:

وإسراج السرج الكثيرة في السكك والأسواق ليلة البراءة بدعة، وكذا في المساجد، ويضمن القيم، وكذا يضمن إذا أسرف في السرج في شهر رمضان..(وفيه ص٣٣٢):صغير كان يأخذ من السقاية ماء لإصلاح الدواة أو قصعة للشرب ثم بلغ وندم لا يكفيه الندم بل يرد الضمان إلى القيم، ولا يجزيه صب مثله في السقاية.[1]

طلبہ کے احوال جاننے کے لئے جاسوسی کرنا

قرآن کریم میں تجسس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اور احادیثِ مبارکہ میں اس عمل پر سخت وعید وارد ہوئی ہے، اس لئے تجسس کرنا شرعاً بالکل ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے۔ تجسس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی ٹوہ میں رہاجائے اور اس کی خفیہ کمزوریوں اور عیوب کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جو اس کے ناگواری کا باعث ہو۔ "تفسیر ماتریدی" میں ہے:

وقوله – عَزَّ وَجَلَّ –: (وَلَا تَجَسَّسُوا) التجسس: هو تكلف طلب المساوئ في الناس من غير أن يظهر منهم من أسبابها شيء، فنهى عن تكلف طلب ذلك أو من الإظهار وأمر بالستر.[2]

---

[1] مجمع الضمانات،باب في الوقف،ج١ص ٣٢٦.

[2] تأويلات أهل السنة، سورة الحجرات،ج٩ص٣٣٦.

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اس طرح تجسس کرنا عام حالات میں ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ مخصوص حالات میں ایسا کرنا جائز اور بعض میں ضروری ہو جاتا ہے[1] بعض مدارس میں طلبہ کی خفیہ نگرانی کی جاتی ہے اوراس میں اتنے مبالغہ سے کام لیاجاتا ہے کہ ان کی خفیہ عیوب پر بھی جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس حد تک تجاوز کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس میں احتیاط واعتدال کی ضرورت ہے۔

اڈنٹی کارڈ کے لئے تصویر کھنچوانا

جاندار چیز کی تصویر کھنچوانا شرعاً جائز نہیں ہے، احادیث مبارکہ میں اس کی بڑی سخت مذمت کی گئی ہے اور شدید وعیدیں اس پر وارد ہوئی ہیں[2]۔ڈیجیٹل تصویر کے تصویر ہونے میں اہل علم کی آراء مختلف ہیں لیکن پرنٹ تصویر کے تصویر ہونے اور حرام ہونے میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے، برصغیر پاک وہند کے سب معتمد اہل علم اس کے قائل ہیں۔اس لئے ایسی تصویر کھنچوانا جائز نہیں ہے، اس کا مطالبہ کرنا اور کسی کو اس پر مجبور کرنا بھی ناجائز ہے، البتہ جس طرح اضطرار و مجبوری کی حالت میں دیگر حرام

---

[1] (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: "نصاب الاحتساب"، ص۳۴۰" بریقہ محمودیہ" ج۳ص۲۵۵۔اور "موسوعہ فقہیہ کویتیہ"، ج۳ص۲۸۰)۔

[2] تصویر کی مذمت وممانعت کے متعلق روایات کافی زیادہ ہیں۔ ہمارے تخصص فی الافتاء کے ایک طالب علم "شاہ حسین صوابوی" نے اس سے متعلق چالیس روایات کو ایک رسالہ کی شکل میں یکجا کیا ہے۔افسوس ہے کہ بہت سے گناہوں کے گناہ ہونے کا تصور بھی عام معاشرے کے ذہن سے نکل گیا ہے اور وہ اب کوئی قابل نفرت امور نہیں بلکہ رواج عام کا حصہ اور روز مرہ کے معمولات کے اجزاء بن چکی ہیں، ان میں جاندار اشیاء کی تصویر کھینچنے اور کھنچوانے کا گناہ سر فہرست ہوتا جارہا ہے۔ بعض علاقوں اور موسموں میں نوبت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اب دین دار اور اہلِ علم وفضل کو بھی اس کے ناجائز ہونے کے دلائل وجوہات بتانے پڑتے ہیں۔ فیا غربۃ الاسلام!

چیزوں میں گنجائش پیدا ہوجاتی ہے یوں ہی اگر کہیں تصویر کی بھی واقعۃً کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے جواس کے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو تو اس کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن یہ گنجائش بدرجہ مجبوری اور بقدر مجبوری ہوگی، اس سے تجاوز کرنا درست نہیں ہوگا۔

نیز صرف چلے دستور کی پاسداری یا اوہام ومفروضات جیسی باتیں شرعی ضرورت میں داخل نہیں ہیں اور محض ان باتوں کی بناء پر کسی ناجائز چیز کا استعمال درست نہیں ہوتا۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ اگر کہیں تصویر کی واقعی ضرورت پیش آئے اوراس کی وجہ سے طلبہ کی تصویر کھینچوانی پڑے اور کسی جائز متبادل راستے سے اس ضرورت کی تکمیل نہ ہوسکتی ہو، تو بھی چونکہ مدرسہ ایک تربیت گاہ بھی ہے، اس لئے یہ بات اچھی طرح سمجھادینی چاہئے کہ اصل حکم یہی ہے کہ تصویر جائز نہیں ہے لیکن ہم ایک شرعی ضرورت ومجبوری کی وجہ سے بادل نخواستہ اس کا ارتکاب کررہے ہیں۔

سند دینے پر طالب علم سے رقم لینا

بعض جگہ یہ دیکھا گیاہے کہ طالب علم نے وفاق المدارس کے تحت کسی درجہ کا امتحان دیااور پھر جب اس کی سند مدرسہ میں پہنچی تو منتظم حضرات سند بلاعوض نہیں دیتے بلکہ اس پر کچھ معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ یہ شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سند طالب علم کا حق ہے، مدرسہ کے پاس اس کی حیثیت امانت کی ہے، لہٰذا اس کے فراہم کردینے پر جبری معاوضہ لیناجائز نہیں ہے۔ البتہ اگر اس طرح کوئی جبر کی فضاء نہ ہواور شرماشرمی کا ماحول بھی نہ ہو، یوں ہی کوئی طالب علم اپنی دلی رضامندی سے ادارے کے ساتھ تعاون کرناچاہے تو بہتر ہے۔

طلبہ کو ختم کروانے کے لئے بھیجنا

تحفیظ کے مدارس میں بچوں کو بعض اوقات ختم قرآن کروانے کے لئے کسی کے گھر وغیرہ بھیج دیا جاتا ہے، اس کو معمول بنانا ناپسندیدہ ہے، اگر معمول بنائے بغیر کبھی کبھار کیا جائے تو بھی مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا لازم ہے:

۱۔ ختم میں کوئی ناجائز بات شامل نہ ہو، مثلاً ایصال ثواب کے لئے ختم کروانے کی صورت میں معاوضہ نہ ملے چاہے وہ نقد کی صورت میں ہو یا کھانے وغیرہ کی شکل میں۔

۲۔ اس سے طلبہ اور علماء کی توہین نہ ہوتی ہو۔

۳۔ اس سے طلبہ کے اوقات بلاوجہ ضائع ہونے یا ان کے اخلاق وعادات بگڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

طلبہ کا گھر گھر جاکر کھانا مانگنا

صوبہ سرحد اور بلوچستان وغیرہ کے بہت سے علاقوں میں یہ رواج ہے کہ مدرسہ کی طرف سے کھانا پکانے کا انتظام نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے یہ ترتیب مقرر کی جاتی ہے کہ چند چھوٹی عمر کے طلبہ کو آس پاس گھروں میں بھیجا جاتا ہے اور وہ وہاں سے کھانا جمع کرکے مدرسہ لاتے ہیں جو وہاں مقیم طلبہ کھاتے ہیں، عام طور پر اس کو "وظیفہ مانگنا" کہا جاتا ہے۔

"وظیفہ مانگنے" کی اس ترتیب میں اس وقت متعدد شرعی اور اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہیں[1]، اس لئے جہاں تک ہو سکے، اس سے احتراز ہی کرلینا چاہئے، اس کے علاوہ

---

[1] ان خرابیوں کی پوری تفصیل مؤلف کے ایک مضمون میں مذکور ہے جو چند سال پہلے صوابی کے سہ ماہی رسالہ "الصدیق" میں شائع ہوا تھا اور اب مؤلف کی کتاب "علمی وفقہی مضامین" کا حصہ بن چکا ہے، تفصیل کے لئے اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

کوئی مناسب نظم بنانا چاہیئے، اس کا ایک آسان حل یہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے کہ جن گھروں والے آمادگی کے ساتھ کھانے دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں، ان ہی سے بات کی جائے کہ وہ اس کے برابر مالیت مدرسہ میں جمع کرلیا کریں، یا ماہانہ / سالانہ حساب سے اجناس وہاں جمع کرلیا کریں۔

****

بابِ پنجم:

- مدارس سے متعلق متفرق مسائل واحکام
- مدارس میں دستار بندی کی تقاریب منعقد کرانا
- مدرسے کے املاک کا استعمال
- بنات کے مدارس سے متعلق مسائل واحکام

مدرسہ کی مسجد کا حکم

متعلقہ مدرسے / طلبہ کی مصالح کے لئے مدارس کے اندر مسجد بنانا جائز بلکہ قریب کوئی باقاعدہ شرعی مسجد نہ ہو تو مستحسن ہے، تاہم ایک بار جب باقاعدہ مسجد بنائی جائے تو اس کا وہی حکم ہوگا جو عام مساجد کا ہے، اس کو اپنی جگہ برقرار رکھنا ضروری ہے، دیگر گاموں کے لئے بلاضرورت استعمال نہ کرنا یا مساجد کے آداب واحترام کے خلاف کوئی کام وبات کرنا مسجد کی بے توقیری اور خلاف ادب ہے جس سے بچنے کا پورا پورا اہتمام کرلینا چاہئے، خاص کر مدرسہ کے ماحول میں جس کو دینی تربیت کا گہوراہ بننا چاہئے۔

"فتاوی شامی" میں ہے:

(قوله ومدرسة) ما يبنىٰ لسكنىٰ طلبة العلم ويجعل لها مدرس ومكان للدرس، لكن إذا كان فيها مسجد فحكمه كغيره من المساجد. ففي وقف القنية: المساجد التي في المدارس مساجد لأنهم لا يمنعون الناس من الصلاة فيها، وإذا أغلقت يكون فيها جماعة من أهلها.[١]

تقریبِ دستاربندی منعقد کرنا

(دستاربندی کے تقاریب کے متعلق چند سال پہلے کچھ فتاویٰ لکھنے کی توفیق ہوئی تھی، یہاں مزید کچھ لکھنے کی جگہ انہی فتاویٰ کو درج کیا جاتا ہے)

پہلا فتویٰ:

بخدمت جناب مفتی صاحبان:

---

[١] كتاب الصلاة،باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها،ج١،ص٦٥٧.

بعض مہتممین دستار بندی (ختم قرآن وختم بخاری) کے سلسلے میں فارغ التحصیل بچوں کے والدین سے رقم طے کرلیتے ہیں مثلاً ہر ایک سے کہاجاتا ہے کہ وہ ہزار روپے لائے، توان میں سے بعض توبخوشی ورغبت دیتے ہیں بلکہ اکثر توزیادہ بھی دیتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ طیب نفس کے بغیر دیتے ہیں، اگر ان کی رضامندی کو ملحوظ خاطر رکھیں تووہ چارپانچ سوسے زیادہ نہیں دیتے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ:ا۔شرعاًدستار بندی کا ثبوت ہے یانہیں؟

۲۔یہ طریقہ کار درست ہے یانہیں؟ متبادل کسی انتظام یا تجویز کی کوئی اچھی صورت بھی لکھ دی جائے تاکہ آئندہ اس پر عمل کیاجائے۔

۳۔ایسے پیسوں کا دستار بندی میں استعمال کرنا جائز ہے یانہیں؟

مستفتی:ہارون الرشید، مردان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب حامداومصلیاومسلما

ابتدامیں جب دستار بندی کارواج شروع ہواتوبظاہر اس کا اصل مقصود اظہارِ اعتماد ہوتا تھا،انتظامیہ اپنے مدرسہ کے فضلاءپراظہار اعتماد کے لئے لوگوں کے سامنے ان کے سروں پر پگڑیاں رکھتے تھے،اس حد تک تواس میں کوئی خرابی نہیں تھی، اپنے اعتماد کے اظہار کے لئے کسی کے سرپر پگڑیاں رکھنا بعض روایات سے بھی ثابت ہے چنانچہ حضور ﷺ نے خیبر وغیرہ موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سرپر پگڑی رکھی تھی(ملاحظہ فرمائیں: منہاج السنن ج۵ص۱۳۶) لیکن رفتہ رفتہ اس میں کچھ کوتاہیاں شامل ہوتی رہی جس کی وجہ سے اب اس کی کھلی چھوٹ دینااوراس کو مطلقاً جائز کہنا مشکل ہوتا جارہاہے۔

اب اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی دستار بندی میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے تو اس کی شرعاً اجازت ہے ورنہ نہیں۔

ا۔ دستار بندی کا اصل مقصد چونکہ فارغ ہونے والے طلبہ پر اظہارِ اعتماد ہے یعنی حاضرین کے سامنے اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ جو طالب علم جس شعبہ سے فارغ ہو رہا ہے، اس پر اس شعبہ کی حد تک تسلی کی جا سکتی ہے مثلاً تخصص سے فارغ ہونے والے طلبہ پر اظہار اعتماد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس پر فقہ و فتویٰ کے باب میں اعتماد کر سکتے ہیں، گویا مدرسہ اور دستار بندی کے منتظمین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فارغ ہونے والے فضلائے کرام اس منصب کے اہل ہیں اور عام لوگ ان کی طرف اپنے دینی مسائل کے حل کے لئے رجوع کر سکتے ہیں، اس لحاظ سے دستار بندی کی حیثیت گویا گواہی کی سی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ منتظمین کے خیال میں فضلاء واقعۃً اس منصب کے اہل ہو، اگر اس بات کا لحاظ نہ رکھا گیا تو یہ اپنے خیالات کا خلاف واقع اظہار تو ہے ہی بلکہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ جھوٹی گواہی کے شدید وعید میں داخل نہ ہو جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"بعض مدارس کی رسم ہے کہ جب طالب علم نے کتابیں پڑھ لیں، خواہ اس کی استعداد ہو یا نہ ہو، اس کو فضیلت کی سند دیتے ہیں اور دستار بندی کر دیتے ہیں (لیکن) غور کرنا چاہئے کہ دستار بندی کی رسم واقع میں اساتذہ و مشائخ کی طرف سے عوام کے روبرو اس امر کا اظہار اور شہادت ہے کہ یہ شخص ہمارے نزدیک اس قابل ہے کہ دین میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اس سے مسائل پوچھ کر عمل کیا جائے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص آج سے مقتدائے دین ہے، جب اس کی حقیقت یہ ہے تو جو شرائط شہادت کے ہیں وہ اس میں بھی ہونا واجب ہیں، اور شہادت کی بڑی شرط یہ ہے کہ شاہد کو اس امر کا پورا

علم ویقین ہو جس کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ صحیح ہے تا کہ اس کو جھوٹ کا گناہ اور دوسروں کو دھوکہ دینے کا گناہ نہ ہو اور کسی کو اس سے ضرر نہ پہنچے۔

اسی طرح یہاں بھی اس شخص کی نسبت پوری تحقیق ہونی چاہئے کہ (یہ شخص جس کو سند دی جارہی ہے) مقتدا فی الدین بننے کے قابل ہے یا نہیں؟ اگر علماء حاضرین کو اس پر پورا اطمینان ہو اور اس کی علمی و عملی حالت قابل قناعت ہو تو دستاربندی بہت خوب (اچھی) رسم ہے کہ اس میں ناواقفوں کے روبرو اظہار ہو جاتا ہے بشرطیکہ تکلفات زائد جس میں کہ ریا واسراف لازم نہ کئے جائیں، اور بدون اہلیت کے ہرگز ہرگز دستاربندی نہ کی جائے، نہ سند دی جائے کہ بجز اضلال خلق (مخلوق کو گمراہ کرنے کے) اس کا دوسرا کیا ثمرہ ہے؟" (تحفۃ العلماء ج۱ ص۴۱۴) بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ج۱۵ ص ۶۲۲، ادارۃ الفاروق کراچی۔

اسی طرح کسی کے سر پر اس طریقہ سے دستار رکھنا درحقیقت مخاطب کو اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دینا ہے اور اگر فارغ ہونے والے طالب علم کے اہلیت کا یقین نہ ہو تو ایسا مشورہ خیانت میں داخل ہے جو کہ ناجائز اور گناہ ہے، پھر دینی رہنمائی کے باب میں خیانت کرنا اور بھی زیادہ مذموم ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

شرح مشكل الآثار:

قال رسول الله عليه السلام: " من قال علي ما لم أقل فليتبوأ بيتا في جهنم ومن أفتى بغير علم كان إثمه على من أفتاه ومن أشار على أخيه بأمر يعلم أن الرشد في غيره فقد خانه "(باب بيان مشكل ما

روي عن رسول الله عليه السلام من قوله: " من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار.[1] ج١ص٣٦٥، رقم الحديث: ٤١٠)

۲۔اس کو اپنی حیثیت سے آگے نہ بڑھایاجائے کہ دیگر شرعی واجبات کی طرح ہر حال میں اس کاالتزام کیاجائے۔

شرح المشكاة للطيبي:

أن من أصر علي أمر مندوب، وجعله عزماً ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال، فكيف بمن أصر علي بدعة ومنكر؟[2]

۳۔مدرسہ کے عمومی فنڈ سے دستاربندی کے تمام اخراجات کرنا شرعاً درست نہیں، بلکہ مدرسہ کی رقم سے وہی اخراجات کئے جاسکتے ہیں جس میں مدرسہ کی مصلحت ہے، لہٰذا دستاربندی کے وہ مصارف جس میں مدرسہ کی کوئی مصلحت نہ ہو مثلاً تمام حاضرین کو کھانا کھلانا، ان جیسی اخراجات مدرسہ کے فنڈ سے پوری کرنا شرعاًناجائز ہے، اس لئے یاتو اس قسم کے مصارف کو برداشت کرنے کی سرے سے زحمت ہی نہ اٹھائی جائے یا خاص اسی عنوان کے ساتھ اس طریقے سے چندہ جمع کیاجائے جس میں دین اور اہلِ دین کی ذلت بھی نہ ہو اور نہ ہی کسی سے خطاب خاص کیاجائے جس کی وجہ سے وہ جبریا کہنے والے کے جاہ وجلال وغیرہ امور کی وجہ سے محض شرماشرمی میں چندہ دیدے اور دل سے راضی نہ ہو۔

---

[1] الجزء١، بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: " مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتعمدًا فَلْيَتبوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ،ج١،ص٣٦٥.

[2] كتاب الصلاة،باب الدعاء في التشهد.ج٣،ص١٠٥١.

فتاوى قاضي خان:

رجل أوصىٰ بشيء لعمارة المسجد في أي شيء يصرف ذلك المال قال أبو القاسم رحمه الله تعالىٰ يصرف فيما كان من البناء دون التزيين قيل له أيصرف ذلك المال في المنارة قال ذلك من بناء المسجد، وعن أبي بكر البلخي رحمه الله تعالىٰ أنه سئل عن الوقف علىٰ المسجد أيجوز لهم أن يبنوا منارة من غلة المسجد قال إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به وإن كان بحال يسمع الجيران الأذان بغير منارة فلا أرىٰ لهم أن يفعلوا ذلك، وليس للقيم أن يتخذ من الوقف علىٰ عمارة المسجد شرفا أو ينتقش المسجد من ذلك ولو فعل يكون ضامنا، رجل أوصىٰ بثلث ماله لأعمال البر هل يجوز أن يسرج المسجد من ذلك قال الفقيه أبو بكر رحمه الله تعالىٰ يجوز ولا يجوز أن يزاد علىٰ سراج المسجد لأن ذلك إسراف سواء كان في رمضان أو في غيره ولا يزين المسجد بهذه الوصية...مسجد بجنبه فارقين يضر بحائط المسجد ضررا بينا فأراد القيم أو أهل المسجد أن يتخذ من مال المسجد حصنا بجنب حائط المسجد ليمنع الضرر عن المسجد قالوا إن كان الوقف علىٰ مصالح المسجد جاز للقيم ذلك لأن هذا من مصالح المسجد وإن

كان الوقف على عمارة المسجد لا يجوز لأن هذا ليس من عمارة المسجد.[1]

۴۔ بہت سے مدارس میں دستاربندی کا خرچہ خود طلبہ یا ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے جیسا کہ سوال میں بھی اس کا ذکر ہے، اگر خرچہ دینے والے سب لوگ اپنی دلی خوشی اور رضامندی سے دینا چاہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ہر ایک کے ذمہ چندہ کی خاص مقدار مقرر کرنا اور اس سے خصوصی خطاب کرنے میں بیشتر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب شرما شرمی میں دیدیتا ہے اور بعض اوقات تو اتنی رقم وصول کی جاتی ہے جس کی ہر ایک طالب علم / سرپرست کی وسعت بھی نہیں ہوتی لیکن اہل مدرسہ کے جاہ وجلال یا ان کی احسان شناسی کے خاطر اور بسا اوقات بدنامی سے بچنے کی خاطر طیب نفس کے بغیر ہی مطلوبہ رقم کا انتظام کر لیا جاتا ہے، ایسا رویہ اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں، مروّجہ دستاربندی کوئی ایسی شرعی ضرورت نہیں جس کے لئے کسی سے زبردستی رقم لینے کی کوئی گنجائش نکل سکے۔

السنن الكبرىٰ للبيهقي:

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ عصا أخيه بغير طيب نفسه، وذلك لشدة ما حرم الله عز وجل مال المسلم علىٰ المسلم.[2]

۵۔ کھانے پینے وغیرہ انتظامات میں بے فائدہ خرچ اور اسراف سے گریز کیا جائے۔

---

[1] كتاب الوقف، باب الرجل يجعل داره مسجدا أو خانا أو سقاية أو مقبرة، ج٣ص١٦٤.

[2] كتاب الغصب، باب من غصب لوحا فأدخله في سفينة، ج٦ص١٦٥.

٦۔ تقریب کے دوران مدرسہ کے انہی صفات وحالات کو بیان کرنے پر اکتفاء کیا جائے جو اس میں واقعۃً موجود ہوں، اوصاف بیان کرنے میں مبالغہ کرنا اور غیر واقعی صفات کا اظہار کرنا ناجائز اور گناہ ہے، اسی طرح مقررین وغیرہ مندوبین کی غیر واقعی صفات بیان کرنا اور ان کے القاب بیان کرنے میں حقیقت سے زیادہ مبالغہ آمیزی کرنا ناجائز اور گناہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

الدر المختار:

ويكره تحريما وصفه بما ليس فيه.[١]

٧۔ اگر مسجد میں تقریب کا انعقاد کیا جارہا ہو تو ضروری ہے کہ مسجد کے حقوق وآداب کی رعایت رکھی جائے، خصوصاً اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ مسجد کے سامان کو صرف اسی حد تک استعمال کیا جائے جس حد تک اس کا استعمال جائز ہو یعنی مصالح مسجد کے علاوہ استعمال کرنے سے گریز کرنا ضروری ہے، دیہات میں چونکہ عام طور پر مدارس مساجد کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں، اس لئے وہاں کے مدارس کے اندر یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مسجد کا سامان مسجد کے حدود سے باہر نکال کر بے دریغ ان جیسی تقریبات میں استعمال کیا جاتا ہے، ایسا کرنا بالکل جائز نہیں بلکہ مسجد کے سامان کے مسجد کے مقاصد ومصالح کے لئے مسجد ہی میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اسعاف میں ہے:

وليس لمتولي المسجد أن يحمل سراج المسجد إلى بيته.[٢]

---

[١] كتاب الصلاة،باب الجمعة، ج٢ص١٤٩.

[٢] الإسعاف فى أحكام الأوقاف:باب بناء المساجد والربط والسقايات،ص:٧٨.

وفيه: ويتحرىٰ في تصرفاته النظر للوقف والغبطة لأن الولاية مقيدة به حتىٰ لو آجر الوقف من نفسه أو سكنه بأجرة المثل لا يجوز.[1]

شامی میں ہے:

(اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه) بسبب خراب وقف أحدهما (جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه) لأنهما حينئذ كشيء واحد. (وإن اختلف أحدهما) بأن بنىٰ رجلان مسجدين أو رجل مسجدا ومدرسة ووقف عليهما أوقافا (لا) يجوز له ذلك.[2]

٨۔ لاؤڈ سپیکر کو اتنا تیز استعمال نہ کیا جائے جس سے لوگوں کے معاملات میں حرج واقع ہو جائے۔

امید ہے اس تفصیل سے سب سوالوں کا جواب واضح ہو چکا ہو گا، اگر اس کے بعد بھی کچھ خلجان باقی رہے تو دوبارہ سوال کیا جائے۔

دوسرا فتویٰ:

سوال: ایک عرصہ سے میں ہمارے مدارس میں مروج دستار بندیوں کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں اسی کے متعلق چند سوالات پیش خدمت ہیں اس کا جواب عنایت فرمائیں:

١۔ دستار بندی کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[1] باب بناء المساجد والربط والسقايات،ص٥٦.

[2] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين:كتاب الوقف،مطلب في وقف المنقول تبعا للعقار،ج٤ص٣٦٠.

۲۔ صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے دستار بندی کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

۳۔ تحفیظ کے مدارس میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ایک بچے کے ابھی تین چار پارے حفظ باقی ہے لیکن دستار بندی کا موسم آیا تو اس کا نام بھی شامل کر دیتے ہیں تا کہ حفاظ کی تعداد زیادہ ہو جائے، اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسمی طور پر حفظ تو مکمل کر چکا ہے لیکن حفظ انتہائی کمزور ہے ابھی گردان کرنا اور دہرانا باقی ہے کہ دستار بندی کا موسم آیا تو اس کا نام بھی شامل کر لیتے ہیں، لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ پکے حافظ فارغ ہوئے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

۴۔ ہمارے یہاں بالخصوص حفظ کے مدارس میں رواج ہے کہ دستار بندی سے کچھ دن پہلے فارغ ہونے والے بچوں کے والدین سے مخصوص رقم کبھی تین ہزار اور کبھی پانچ ہزار وصول کرتے ہیں، یہ پیسے والد وغیرہ نے ضرور دینا ہے ورنہ اس کا لڑکا دستار بندی میں شامل نہیں ہوگا، مدرسہ انتظامیہ ان پیسوں سے پوری دستار بندی کے اخراجات، خصوصی مہمانوں کے آمد ورفت اور قیام وطعام کا انتظام کرتی ہے مہمانوں کے لئے خصوصی طعام اور عام افراد کو بھی عام سادہ کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

مستفتی: قاری محمد خورشید صاحب، دیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب حامدا ومصلیا ومسلما

(۱)۔۔۔ دستار بندی طلبہ پر متعلقہ فن / میدان میں اظہارِ اعتماد کا نام ہے اور یہ فی نفسہ مباح کام ہے۔

(۲)۔۔۔دیگر تمام اعمال کی طرح دستار بندی بھی اخلاص اور دینی مصلحت ومفاد کی خاطر ہی منعقد کر لینی چاہئے، ذاتی یا دنیوی مقاصد کی خاطر لوگوں کو دکھانے کی غرض سے ان جیسی تقریبات کو منعقد کرنا نہایت مذموم اور شنیع اقدام ہے۔

(۳)۔۔۔محض تعداد بڑھانے دکھانے کے لئے غیر حافظ کو حافظ کہلوانا شرعاً جائز نہیں، اگر حفظ مکمل ہو لیکن یاد داشت کمزور ہو تو دستار بندی میں اس کا نام شامل کیا جاسکتا ہے تاہم لوگوں کے سامنے اس کو پکا حافظ یا اپنے واقعی حیثیت سے بڑھ کر ظاہر کرنا غلط بیانی ہے جو کہ ناجائز اور ممنوع ہے، یاد رہے کہ دستار بندی بلکہ کسی بھی تقریب میں صرف انہی صفات کے بیان کرنے پر اکتفاء کر لینا ضروری ہے جو فارغ ہونے والے طلبہ اور اس مدرسہ میں واقعۃً موجود ہوں، اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لینا شرعاً ممنوع بھی ہے اور اصلاح وتربیت کے حوالہ سے مضر بھی۔

الدر المختار میں ہے:

ویکرہ تحریما وصفه بما لیس فیه.[1]

(۴)۔۔۔اس طرح رقم جمع کرنے میں کئی دینی مفاسد ہیں اس لئے اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔

مدرسہ کی اشیاء عاریت کے طور پر استعمال کرنا

مدرسہ کی اشیاء، چاہے وہ چیز خود وقف ہو یا مدرسہ کی ملکیت، وہ مدرسہ کے مصالح میں استعمال ہونے کے لئے مختص ہوتی ہیں، ارباب اہتمام وغیرہ کی ملکیت نہیں ہوتی، لہٰذا طلبہ ومدرسین وغیرہ کے علاوہ عام افراد کے لئے یہ چیزیں عاریت

---

[1] الدر المختار: کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ ج۲ص۱٤۹.

کے طور پر استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں ہے یوں ہی ذمہ داران مدرسہ کے لئے ان اشیاء کو عاریت پر دینا بھی درست نہیں ہے، دیہاتی علاقوں میں مدرسہ کی مختلف چیزیں مثلاً سیڑھی، پائپ، کلہاڑی وغیرہ کام کے اوزار آس پاس کے لوگ گھر لے جاکر بے تکلف استعمال کرتے ہیں، یہ شرعاًناجائز ہے جس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

"اشباہ" میں ہے:

ولا تجوز إعارة أدواته لمسجد آخر ولا يشغل المسجد بالمتاع إلا للخوف في الفتنة العامة.[١]

مدرسہ کو شاخ کا درجہ دینا

اگر واقف نے وقف کرتے وقت اس کے متعلق کوئی شرط لگائی تھی تو اسی کی پابندی ضروری ہے اوراگر ایسی کوئی صراحت نہیں ہوئی تو پھر متعلقہ مدرسہ کے فوائد ومصالح کا جائزہ لیاجائے گا کہ شاخ ٹھہرانے میں مصلحت ہے یا مستقل حیثیت کے ساتھ برقرار رہنے میں؟اوراسی مصلحت کے مطابق کوئی پہلو اختیار کیاجائے گا۔

مرکزاور شاخ کے اموال کا حکم

شاخ کی حیثیت مدرسہ کے ایک جزء اور شعبہ کی سی ہے، لہٰذا اگر کسی خاص شاخ کے نام پر چندہ جمع ہوجائے تو وہ اسی شاخ میں استعمال کرنا ضروری ہے، مرکز میں خرچ کرنا درست نہیں ہے اور اگر ایسی کوئی تصریح نہ ہو بلکہ شاخ ہونے کی حیثیت سے چندہ جمع ہوجائے تو وہ حسب مصلحت مرکز اور شاخ دونوں جگہ استعمال کیاجاسکتا ہے،یوں ہی مرکز میں جو چندہ جمع ہوجائے اور دینےوالے کی طرف سے کسی خاص

---

[١] الأشباه والنظائر مع الغمز، الفن الثالث،ج٤ص ٦٤.

مصرف کی تخصیص نہ ہو تو ایسا چندہ بھی حسب مصلحت مرکز میں بھی صرف کیا جاسکتا ہے اور منسلک شاخوں میں بھی۔

مدرسہ کی طرف سے درسی کتابیں فراہم کرنا

بعض بڑے مدارس میں مدرسہ کی طرف سے طلبہ کو درسی کتابیں مہیا کی جاتی ہیں، جو طلبہ نادار ہوتے ہیں، وہ ان کتابوں میں اپنی تعلیم پوری کرتے ہیں۔ یہ انتظام کرنا بالکل جائز بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے، تاہم کتابیں فراہم کرنے کے لئے کوئی مناسب ضابطہ عمل طے کر دینا چاہئے اور طلبہ کو اس سے آگاہ بھی کر لینا چاہئے تاکہ وقف کی چیز کا غیر محتاط استعمال نہ ہو جائے۔ ان کتابوں کی حیثیت طلبہ کے پاس امانت کی ہوتی ہے، لہٰذا احتیاط و دیانت کے ساتھ اس کا استعمال کیا جائے، حفاظت میں کوتاہی کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اس پر اپنا پتہ لکھنا اور حاشیہ چڑھانا وغیرہ بھی درست نہیں ہے۔ حضرات فقہاء کرام تو یہاں تک صراحت فرماتے ہیں کہ اگر عاریت وامانت پر کوئی کتاب لے لی جائے اور اس کی عبارت میں کوئی واقعی غلطی سامنے آئے تو بھی عام کتابوں میں اصل مالک کی رضامندی کے بغیر اس کو از خود درست کرنا ممنوع ہے۔ "در مختار" میں ہے:

استعار كتابا فوجد به خطأ أصلحه إن علم رضا صاحبه. قلت: ولا يأثم بتركه إلا في القرآن لأن إصلاحه واجب بخط مناسب.[١]

دوسرے مقاصد کے لئے تکبیر و تلاوت کرنا

قرآن کریم کی تلاوت ہو یا ذکر و تسبیح کے دیگر کلمات، خاص اللہ تعالیٰ کے ذکر وعبادت ہی کے طور پر اس کا اہتمام کر لینا چاہئے، ذکر کے علاوہ دنیوی مقاصد کے لئے

---

١ الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب العارية، ج٥ص٦٨٦.

اس کا اہتمام کرنا مکروہ ومذموم ہے[1]، لہٰذا بعض جگہ حاضری دینے کے لئے "اللہ اکبر" کہنے کا جو اہتمام کیا جاتا ہے، یا لاؤڈ اسپیکر درست کرنے کے لئے جو تلاوت کی جاتی ہے، وہ درست نہیں ہے بلکہ قابلِ اصلاح ہے۔

مدرسہ کی زمین میں قبر بنانا

مدرسہ کے لئے جو زمین وقف کی جائے، اس پر کسی شخص کا خصوصی قبر بنانا یا عمومی نوعیت کا قبرستان بنانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ مقبرہ اور مدرسہ دونوں مختلف چیزیں اور جدا جدا جہات ہیں لہٰذا واقف کے منشا کے مطابق زمین کو مدرسہ کے کام میں ہی استعمال کرنا ضروری ہے اور اس میں مقبرہ یا قبر بنانا ناجائز ہے، البتہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت اس میں مقبرہ بنانے کی بھی شرط لگائی تھی تو اس کے مطابق مقبرہ بنانے میں مضائقہ نہیں ہے، "فتاویٰ ہندیہ" میں ہے:

لا يجوز تغيير الوقف عن هيئته فلا يجعل الدار بستانا ولا الخان حماما ولا الرباط دكانا، إلا إذا جعل الواقف إلى الناظر ما يرىٰ فيه مصلحة الوقف، كذا في السراج الوهاج.[2]

مدرسہ کے لئے گاڑی خریدنا اور استعمال کرنا

اس میں دو مسئلے ہیں، ایک یہ ہے کہ مدرسہ کے لئے گاڑی خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا طریقہ استعمال کیا ہوگا؟

---

[1] البتہ جہاں نصوص سے اس کی اجازت ثابت ہو، وہ جگہیں اس مذمت وکراہت سے مستثنیٰ ہیں، مثال کے طور پر نماز کا وقت داخل ہونے کے لئے اذان دینا، نماز شروع ہونے کے اعلام کے لئے اقامت کہنا، علاج ومعالجے کے لئے قرآن کریم کی مختلف آیتیں پڑھنا، وغیرہ۔

[2] الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الرابع عشر، ج٢ص ٤٩٠.

جہاں تک پہلا مسئلہ ہے تو اگر کسی مدرسہ میں گاڑی کی کوئی معتد بہ ضرورت نہ ہو تو مدرسہ کی رقم سے گاڑی خریدنا شرعاً درست نہیں، اگر کہیں گاڑی کے بغیر کسی مدرسہ کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، یا اپنی گاڑی خریدے بغیر حرج و تنگی کا اندیشہ ہو اور ذمہ دارانِ مدرسہ گاڑی خریدنے میں ہی مدرسہ کی مصلحت سمجھیں تو ایسی صورت میں مدرسہ کی ضرورت کے مطابق گاڑی خریدنا جائز ہے، پھر گاڑیوں کی تعداد و نوعیت کے بارے میں بھی وقف ہی کی ضروریات و تقاضوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے لہٰذا اگر کسی مدرسہ کی ضرورت و مصلحت موٹر سائیکل سے پوری ہو سکتی ہے تو اس کے لئے ٹیکسی وغیرہ خریدنا درست نہیں، یوں ہی اگر ایک گاڑی سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو زیادہ خریدنے کی گنجائش نہیں۔

جہاں تک گاڑی کے استعمال کرنے کی بات ہے تو چونکہ گاڑی مدرسہ کے مال سے خریدی گئی اس لئے یہ مدرسہ ہی کی ملک شمار ہوگی، اور مدرسہ کی املاک کا حکم پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ:

الف: ایسی چیزیں مدرسہ کے مصالح ہی میں استعمال کرنا جائز ہے اس میں یہ شرط ہے کہ احتیاط و دیانت کے ساتھ استعمال ہو یعنی عام طور پر ان جیسی چیزوں کے استعمال کرنے کا جو طریقہ کار ہو اسی کے مطابق استعمال کی جائے۔

ب: استعمال کرنے والے کے ہاتھ میں ان چیزوں کی حیثیت امانت کی ہوتی ہے لہٰذا اگر ناجائز یا غلط و غیر محتاط استعمال کی وجہ سے گاڑی مکمل طور پر ضائع ہو جائے یا اس میں کوئی نقصان پیدا ہو جائے تو استعمال کرنے والا ضامن ہوگا۔

پہلی بات کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی گاڑی مصالحِ مدرسہ کے علاوہ کسی کام میں استعمال کرنا جائز نہ ہو کیونکہ گاڑی ہے مدرسہ کی ملکیت، لہٰذا مہتمم، ناظم یا مدرسہ کے کسی دوسرے

معاون کے لئے اس کو اپنی ذاتی کاموں میں استعمال کرنا درست نہیں، بسا اوقات ایسا کیاجاتاہے کہ مدرسہ کے سب یا بعض معاونین ایسی گاڑی یہ کہہ کہ استعمال کرتے ہیں کہ پٹرول اپنی طرف سے ڈالتے ہیں، اس میں شرعی لحاظ سے خوب احتیاط کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ پٹرول کا خرچہ گو مدرسہ پر عائد نہ ہو لیکن خود گاڑی تو مدرسہ کی استعمال ہوئی، گویا فقہی لحاظ سے مدرسہ کی گاڑی بطور عاریت استعمال ہوتی ہے جبکہ مدرسہ کے مال کو عام حالات میں بطور عاریت لینا دینا بھی جائز نہیں ہے۔

"اشباہ" میں ہے:

ولا تجوز إعارة أدواته لمسجد آخر ولا يشغل المسجد بالمتاع إلا للخوف في الفتنة العامة.[1]

"فتاویٰ ہندیہ" میں ہے:

ولا تجوز إعارة الوقف والإسكان فيه، كذا في محيط السرخسي۔ متولي الوقف إذا أسكن رجلا بغير أجرة ذكر هلال رحمه الله تعالیٰ أنه لا شيء علی الساكن وعامة المتأخرين من المشايخ رحمهم الله تعالیٰ أن عليه أجر المثل، سواء كانت الدار معدة للاستغلال أو لم تكن صيانة للوقف وعليه الفتویٰ، وكذا قالوا فيمن سكن دار الوقف بغير أمر القيم: كان عليه أجر المثل بالغا ما بلغ كذا في المضمرات.[2]

---

[1] الأشباه والنظائر مع الغمز، الفن الثالث، ج٤ص ٦٤.

[2] الفتاوی الهندية، كتاب الوقف، الباب الخامس في ولاية الوقف، ج٢ص٤٢٠.

ذاتی کام کے لئے گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دینا

البتہ بعض مدارس میں ارباب اہتمام / انتظام کے لئے اپنے ذاتی کاموں میں بھی مدرسہ کی گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، ایسا کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو تنخواہ میں بقدرِ حاجت اضافہ کر دیا جائے، لیکن اگر کہیں مدرسہ کی مصالح کو دیکھتے ہوئے ایسا قانون بنایا گیا ہو تو بھی یہ اہتمام کرلینا چاہئے کہ ذاتی کام میں استعمال کرنے والا پٹرول اپنی طرف سے ڈلوایا کرے مدرسہ پر اس کا بوجھ نہ ڈالے، اگر کہیں مدرسہ کی بھی کچھ ضرورت ہو اور اپنا بھی کچھ کام ہو مثلاً مدرسہ کے کسی کام کے لئے اسلام آباد جانا ضروری ہو اور اپنی ذاتی طور پر وہاں کچھ حاجت درپیش ہو، تو دونوں ضروریات کو سامنے رکھ کر خرچہ تقسیم کرلیا کرے۔

"مجمع الانہر" میں ہے:

(وإن سافر) المضارب (بماله ومال المضاربة) أو خلط ماله بمال المضاربة بإذن رب المال (أو) سافر (بمالين لرجلين أنفق بالحصة) أي توزع النفقة علىٰ قدر الحصص من المال.[1]

مدرسہ کے قوانین کی شرعی حیثیت

مدارس میں مختلف قسم کے قوانین بنائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض قوانین کا تعلق مدرسہ کے املاک (بجلی، گیس، کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ) استعمال کرنے سے ہوتا ہے اس کے لئے تمام مدارس میں وہاں کے حالات وظروف کے مطابق کچھ ضابطہ بنایا جاتا ہے کہ مثلاً استری کرنے پر پابندی لگانا، مدرسہ میں لگے گیس کے چولھے استعمال

---

[1] مجمع الأنهر، كتاب المضاربة،متفرقات المضاربة، ج٢ص ٣٣٤.

کرنے کا کوئی خاص ضابطہ بنانا، مدرسہ میں ٹھنڈے پانی کو کمروں میں لے جانے پر پابندی، فی طالبِ علم مطبخ سے ایک ہی روٹی لینے کا ضابطہ بنانا، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے متعلق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قوانین کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی اس قانون کی مخالفت کر کے مدرسہ کے املاک استعمال کرتا ہے تو کیا وہ صرف قانونی وانتظامی حد تک مجرم شمار ہوگا یا شرعی لحاظ سے بھی گناہ گار ہوگا جس طرح کہ مدرسہ کے متعلقین کے علاوہ کوئی شخص ان املاک کو استعمال کرے؟ یہ سوال اس لئے بھی اہم ہے کہ موجودہ حالات میں مدارس کے مخصوص احوال وظروف اس بات کے مقتضی ہوتے ہیں کہ ان میں مختلف قسم کے قوانین بنائے جائیں، دوسری طرف گویا طلبہ کی سرشت میں ضابطہ کی خلاف ورزی شامل ہے خصوصاً جہاں نگرانی کا نظم کچھ زیادہ مستحکم نہ ہو، اب اگر اس کو گناہ قرار دیا جائے تو مدارس کی معطّر فضائیں معاصی ومنکرات کی منحوس وبے برکت مجالس میں تبدیل ہو جائے گی اور اربابِ انتظام کی ذمہ داری مزید بڑھ جائے گی کہ طلبہ کو ان گناہوں سے بچنے کی کوئی تدبیر بنائی جائے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے اور مختلف اہلِ علم سے مشاورت کرنے کے بعد جو کچھ اس ناکارہ کے ذہن میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان جیسے قوانین میں سے جو قانون اربابِ اہتمام مدارس کی مصلحت کے لئے ضروری سمجھ کر مقرر کرے اور طلبہ کو محض انتظامی یا تربیتی طور پر نہیں بلکہ شرعی طور پر بھی اس کا پابند بنائیں کہ جس کی خلاف ورزی کرنا ان کے خیال کے مطابق مدرسہ کی مصلحت کے خلاف ہو اور اسی لئے خلاف ورزی کی صورت میں ان کی طرف سے املاکِ مدرسہ استعمال کرنے کی ممانعت ہو تو ایسے قانون کی پاسداری کرنا شرعاً بھی لازم ہے اور مخالفت کی صورت میں املاک استعمال کرنا محض انتظامی طور پر ہی نہیں بلکہ شرعی لحاظ سے بھی درست نہیں۔

اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے[1] کہ ارباب اہتمام کی فقہی حیثیت متولی کی ہوتی ہے اور متولی بمنزلہ واقف ہوتا ہے جس طرح واقف کی شرائط کالحاظ رکھنا شرعاً لازم ہے یوں ہی متولی کے عائد کردہ ضوابط کی رعایت رکھنا بھی ضروری ہے اور جس طرح واقف کی شرط کی مخالفت کرنا شرعاً گناہ ہے یوں ہی متولی کے قانون کی بھی یہی حیثیت ہے، البتہ دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ وقف کرتے وقت واقف کو اختیار ہے اگر وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے بھی کوئی شرط لگانا چاہے تو جائز ہے اور متولیانِ وقف کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے جبکہ متولی بہر حال مصالحِ وقف کے لحاظ رکھنے کا پابند ہوتا ہے، مصالحِ وقف سے ہٹ کر محض ذاتی اغراض و مقاصد کو وقف میں سے پورا کرتا ہے تو یہ خیانت شمار ہوگی جس کی وجہ سے وہ گناہ گار بھی ہوگا اور معزول ہونے کا مستحق بھی۔ "شامی" میں ہے:

على أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة.[2]

"در مختار" کا درج ذیل جزئیہ بھی اس کی نظیر بن سکتا ہے:

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) :

---

[1] اس کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مدرسہ میں جن طلبہ کا داخلہ ہو جاتا ہے یا جن مدرسین حضرات کی تقرری ہو جاتی ہے، وہ یہ عہد کرتے ہیں کہ مدرسہ کے ضوابط و قوانین کی رعایت رکھیں گے اور حتی الامکان اسی پر عمل در آمد یقینی بنائیں گے، بعض جگہ زبانی طور پر اس طرح معاہدہ ہوتا ہے اور بعض جگہ تحریری طور پر کسی فارم وغیرہ کی شکل میں، اگر صراحت کے ساتھ ایسا معاہدہ نہ بھی ہو تب بھی معروف و معہود یہی ہے، اب اگر کوئی مدرس یا طالب علم بلاوجہ اور بلا کسی معتد بہ عذر کے متعلقہ مدرسہ کے کسی ضابطہ کی مخالفت کرتا ہے تو یہ وعدہ خلافی ہے جو شرعاً مذموم ہے۔

[2] رد المحتار على الدر المختار، كتاب الوقف، ج٤ص ٤٤٥.

لا يجوز الوضوء من الحياض المعدة للشرب في الصحيح ويمنع من الوضوء منه.[1]

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اہل مدارسِ عربیہ کو مدرّسانِ مدرسہ کے لئے قواعد مرتب کرنا جائز ہے اور مدرّسان پر ان کی پابندی لازم وواجب ہے، بدون پابندی قواعد کے ان کو تنخواہ لینا حلال نہ ہو گا اور جو لوگ مدرّسان مدرسہ کے لئے قواعد مرتّب کرنے کو ناجائز اور مدرّسان پر ان کی پابندی کو غیر لازم سمجھتے ہیں، وہ غالباً مدارس کو بیت المال اور تنخواہ مدرسین کو مثل عطاء بیت المال کے سمجھتے ہیں، مگر یہ خیال ان کا غلط ہے کیونکہ اوّل تو مدارس عربیہ پر بیت المال کی تعریف صادق نہیں ورنہ لازم ہے کہ ان میں علاوہ طلبۂ علم اور مدرّسان مدرسہ کے دوسرے مستحقین بیت المال مثل یتامی، بیوگان ومسافران ومعذورین کا بھی حق ہو، حالانکہ ان کا مدارس میں کچھ حق نہیں، دوسرے ظاہر ہے کہ مدارس کا قیام چندہ دینے والوں کی امداد سے ہے، پس اس کا بیت المال ہونا یانہ ہوناچندہ دینے والوں کی نیت پر ہے اور یقیناً چندہ دینے والے مدارس کو بیت المال اور مدرّسین کی تنخواہ کو عطاء بیت المال کے مثل نہیں سمجھتے بلکہ عموماً چندہ دینے والے مہتممانِ مدرسہ کو اپنا وکیل اور ملازمانِ مدرسہ کو اجیر سمجھتے ہیں، اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کسی مدرسہ کے مدرسین پابندیٔ عمل وپابندیِ وقت وپابندیِ قواعد کو اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے تو یقیناً چندہ دینے والے ایسے مدرسہ مین چندہ دینے سے رُک جائیں گے، جس کو شک ہو وہ اس امر کا اعلان کرکے دیکھ لے کہ پھر مدرسہ میں چندہ کس قدر آتا ہے۔"[2]

---

[1] كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ج٦،ص٤٢٧.

[2] امداد الاحکام، ج۳ص۲۶۵.

مدرسہ کی طرف سے پنشن دینا

مدرسہ کے مال میں سے معزول ہونے والے کمزور اور ضعیف العمر مدرس / ملازم کو پنشن دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق بعض اہل فتویٰ کی رائے یہ ہے کہ اگر چندہ دہندگان کی طرف سے صراحتًا یا دلالۃً اجازت ہو تو پنشن دی جاسکتی ہے صریح اجازت تو ظاہر ہے اور دلالۃً اجازت یہ ہے کہ ان کو پنشن دئے جانے کا علم تھا اور اس کے باوجود چندہ دیا اور کوئی ممانعت نہیں کی، فتاویٰ محمودیہ وغیرہ سے یہی حکم مستفاد ہوتا ہے، فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"سوال: مدرسہ عربیہ کے ضعیف معذور مدرسین کو پنشن دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیا چندہ دینے والوں کو اس کا علم ضروری ہے؟

الجواب حامدا ومصليا: اگر اربابِ مدرسہ نے قانون بناکر شائع کر دیا اور چندہ دینے والوں کو علم ہو گیا کہ ہمارے دئے ہوئے روپیہ سے معذور اور ضعیف العمر کو پنشن بھی دی جاتی ہے، انہوں نے اس کو منظور کر لیا، اس پر اعتراض نہیں کیا تو پنشن دینا درست ہے۔"[1]

ایک دوسرے فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"چندہ دینے والے دینی تعلیم کے لئے چندہ دیتے ہیں، اس کو طلبہ کی ضرورت، طعام، لباس وغیرہ اور مدرسین وملازمین کی تنخواہ میں صرف کرنا درست ہے، وہ لوگ یہی سمجھ کر چندہ دیتے ہیں کہ ان مواقع میں صرف کیا جائے گا، نہ پنشن کا ان کے ذہن میں تصور ہے نہ اس لئے دیتے ہیں، لہذا بغیر ان کی اجازت کے اس روپیہ کو پنشن میں دینا جائز نہیں۔"[2]

---

۱ فتاوی محمودیہ ج۱۵ ص۵۹۷

۲ فتاوی محمودیہ ج۲۳ ص۲۹۰

دوسرا موقف اس کے متعلق یہ ہے کہ مدرسہ کے عمومی چندہ سے پنشن دینا درست نہیں ہے البتہ اگر خاص اسی مد کے لئے چندہ کیا جائے تو جائز ہے، "خیر الفتاویٰ" میں حضرت مفتی عبد الستار صاحب رحمہ اللہ کے ایک فتویٰ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے، فتویٰ یہ ہے:

"موجودہ عمومی چندہ سے پنشن دینا درست نہیں، کیونکہ یہ عرفِ مدارسِ دینیہ کے خلاف ہے، ہاں اگر خاص اس مد کے لئے چندہ کر لیا جائے تو بلاشبہ جائز ہے۔"[۱]

دونوں قسم کے فتاویٰ پر غور کرنے کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا فتویٰ اس قول پر مبنی ہے کہ مہتمم چندہ دہندگان کی طرف سے وکیل ہے اس لئے اگر ان کی اجازت ہو تو پنشن دینا جائز ہے ورنہ نہیں، جبکہ بعد میں اکثر اہل فتویٰ علماء کرام نے یہ موقف اختیار فرمایا ہیں کہ مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے اور اس کے وصول کرنے سے طلبہ اور مدرسہ کا قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، لہٰذا چندہ دیدینے کے بعد یہ مال طلبہ یا مدرسے کا بن جائے گا اور اس میں دینے والوں کی اجازت یا فرمائش کا اعتبار نہ ہوگا جبکہ دیتے وقت کسی خاص مد کی تصریح نہ کی ہو، اور پنشن دینا چونکہ اصلاً تبرع ہے اور عام حالات میں اوقاف کے مال میں سے تبرّع کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا اب اگر مدرسہ کی مصالح اس بات کے مقتضی ہوں کہ معزول ہونے والے مدرسین کو پنشن دی جائے تو بقدرِ مصلحت دینا جائز ہوگا ورنہ تو نہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ، امام خصاف رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں کہ:

---

۱ خیر الفتاوٰی، ج۶ ص۶۳۸

ذكر الخصاف أنه لو أصاب القيم خرس أو عمىٰ أو جنون أو فالج أو نحوه من الآفات، فإن أمكنه الكلام والأمر والنهي والأخذ والإعطاء فله أخذ الأجر، وإلا فلا قال الطرسوسي: ومقتضاه أن المدرس ونحوه إذا أصابه عذر من مرض أو حج بحيث لا يمكنه المباشرة لا يستحق المعلوم لأنه أراد الحكم في المعلوم علىٰ نفس المباشرة فإن وجدت استحق المعلوم وإلا فلا وهذا هو الفقه اه.[1]

اہل بدعت کے مدارس میں چندہ دینا

مسئلہ: اگر کوئی شخص یا جماعت کسی ایسی بدعت کے قائل ہوں جو موجب کفر ہو، مثلاً ختم نبوت کا انکار یا تاویل وغیرہ، تو ایسے لوگ زندیق کے حکم میں ہیں اور ان کے مدارس میں چندہ دینا جائز نہیں ہے، اگر کوئی بدعت اس حد تک نہ پہنچے تو جو لوگ ایسی بدعات کے قائل یا اس پر عامل ہو، وہ مسلمان ہیں اور مسلمان کے ساتھ جائز کام میں تعاون کرنے میں شرعاً مضائقہ نہیں ہے، لہٰذا ان کے مدارس میں چندہ دینا جائز ہے تاہم شرط یہ ہے کہ دیتے وقت کسی ایسے مد کی صراحت نہ کی جائے جس میں بدعت کی ترویج ہوتی ہو اور دینے والے شخص کی نیت بھی درست ہو کہ ناجائز کاموں اور بدعات کی ترویج کرنا مقصود نہ ہو۔ اس کے باوجود بہتر بہر حال یہی ہے کہ ایسے مدارس میں چندہ دیا جائے جو ہر قسم کی بدعات و منکرات سے محفوظ ہوں۔

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الوقف، ج٤ص ٤١٩.

مدرسہ کے باغ کے پھل فروٹ کا حکم

کسی مدرسہ کے اندر کچھ پھل دار یا ناریل وغیرہ کے درخت ہوں اور اس میں پھل آجائے تو طلبہ، عملہ یا حضرات مدرسین کے لئے از خود یہ پھل کاٹ کر بلا معاوضہ استعمال کرنا درست نہیں ہے بلکہ چونکہ یہ پھل بھی مدرسہ کی ملکیت ہے لہٰذا ارباب اہتمام اس کو مدرسہ ہی کے مصالح میں استعمال ہونے کا انتظام کریں، کہ مثلاً پھل کاٹ کر مدرسہ کے طلبہ وغیرہ متعلقین کو مناسب قیمت پر فروخت کر دیں، "شامی" میں ہے:

استأجر دارا موقوفة فيها أشجار مثمرة هل له الأكل منها؟ الظاهر أنه إذا لم يعلم شرط الواقف لم يأكل لما في الحاوي: غرس في المسجد أشجارا تثمر إن غرس للسبيل فلكل مسلم الأكل وإلا فتباع لمصالح المسجد.[1]

مدرسہ کے پھل فروٹ میں عشر

مدرسہ کی فارغ زمین میں کوئی فصل کاشت کرنا / درخت لگوانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مدار تو مدرسہ کی مصلحت پر ہے، جہاں جس قدر درخت لگانے میں مصلحت معلوم ہو، اس کے مطابق لگانا درست ہے۔ تاہم لگانے کے بعد جس طرح عام مملوکہ زمینوں کے پیداوار میں عشر (دسواں حصہ) یا نصفِ عشر (بیسواں حصہ) دینا واجب ہوتا ہے، یوں ہی مدرسہ کی زمین سے حاصل ہونے والے غلہ میں ضابطہ کے مطابق عشر یا نصفِ عشر دینا ضروری ہے۔

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الوقف، مطلب استأجر دارا فيها أشجار، ج ٤ ص ٤٣٢.

ولا يعتبر المالك فيه حتىٰ تجب في أرض الوقف والمكاتب.[1]

"شامی" میں ہے:

(قوله: ووقف) أفاد أن ملك الأرض ليس بشرط لوجوب العشر۔ وإنما الشرط ملك الخارج؛ لأنه يجب في الخارج لا في الأرض، فكان ملكه لها وعدمه سواء بدائع.[2]

"وظیفہ جمع کرنے کی" رسم اوراس کا حکم

دیہات اور پسماندہ علاقوں کے مدارس میں ایک یہ بھی رواج ہے کہ کھانا جمع کرنے کے لئے طلبہ کو گھر گھر بھیجا جاتا ہے، جہاں سے وہ کھانا جمع کر کے مدرسہ لاتے ہیں، اس کو عام اصطلاح میں "وظیفہ جمع کرنا" کہا جاتا ہے۔ فی زمانہ جہاں تک ہو سکے، اس سے احتراز ہی کر لیا جائے، طلبہ کے کھانے کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کوئی دوسرا متبادل نظم اپنایا جائے، مثال کے طور پر:

۱: باستطاعت طلبہ پر معقول مقدار میں معاوضہ دینا مقرر کیا جائے۔

۲: طلبہ کے لئے کھانے کی سہولت / ضرورت بہم پہنچانے کے لئے مناسب انداز میں چندہ کرنے کی ترتیب بنائی جائے، اس ذریعے سے جو رقم جمع ہو جائے، اس سے کھانے کی ضرورت پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳: آس پاس کے لوگوں کی دینی تعلیم اوراسلامی تربیت کی جائے کہ وہ از خود کھانا پہنچایا کریں۔

---

[1] تبيين الحقائق، كتاب العشر، ج١ص٢٩٢.

[2] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب العشر، ج٢ص٣٢٦.

اس کے علاوہ بھی کوئی متبادل نظم اپنایا جاسکتا ہے، واقف کار حضرات سے اس سلسلہ میں مشاورت بھی کی جاسکتی ہے۔ بہر حال "وظیفہ جمع کرنے" کی اس رسم میں اس وقت عام طور پر متعدد دینی خرابیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے اس سے احتراز ہی کرلینا چاہئے۔[1]

فیس مقرر کرنے کا حکم

عصری تعلیمی اداروں میں مختلف قسم کے فیسز کا رواج پہلے سے جاری ہے، اب بعض مدارس میں بھی داخلہ فیس اور ماہانہ فیس وغیرہ کا رجحان بڑھ رہا ہے خصوصاً بنات کے مدارس میں اس کا فروغ زیادہ ہے، فیس مقرر کرنا فی نفسہ کوئی ناجائز نہیں ہے تاہم دینی تعلیم و تعلم کی حد تک اس کا رواج کم سے کم تر ہونا چاہئے، دینی علوم تجارت و کمائی کا سامان ہے نہ نام و شہرت پیدا کرنے کا ذریعہ، بلکہ حاملینِ علم کے پاس ایک مقدس امانت ہے جس کو موقع و محل کے مطابق نقل کرنا بعض اوقات ضروری بن جاتا ہے اور اس میں بلا وجہ کتمان و بخل سے کام لینا شرعی نقطہ نظر سے جرم قرار پاتا ہے، اس لئے اس مقدس فریضہ کی تکمیل پر عوض / فیس لینا زیب نہیں دیتا، خصوصاً اس پر آشوب دور میں، جہاں سمندر کی موجوں کی مانند فتنوں کی بھرمار کی وجہ سے دینی علوم اور مذہبی اقدار کی کوئی زیادہ قدر و قیمت باقی نہیں رہی، امراء و اغنیاء کے ہاں اس علم کی کوئی اہمیت نہیں رہی بلکہ ابتداء اسلام کی طرح ایک بار پھر غریب و فقیر لوگوں کے ہاں ہی دینی علوم و فنون کا بسیرا ہونے لگا ہے، اس دور میں جہاں تک ہو سکے فیس لئے بغیر ہی تعلیم کا انتظام کرلینا چاہئے ورنہ اندیشہ ہے کہ بہت سے خواہش مند لوگ اس سعادت کے حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

البتہ اگر کہیں فیس لئے بغیر تعلیمی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں یا خاص افراد کی حق میں فیس مقرر کرنے میں کوئی خاطر خواہ مصلحت ہو تو بھی مناسب یہ ہے کہ اس کی مقدار کم سے کم تر ہو اور وصولی کا طریقہ کار صاف وشفاف اور آسان ہو۔

فیس کی فقہی حیثیت اور شرائط

فیس در حقیقت اپنی خدمات کے معاوضہ کا نام ہے، اس کی فقہی حیثیت اجرت کی ہے جس چیز پر اجرت لینا جائز ہے اس پر فیس لینا بھی درست ہے، لہٰذا فیس لینے میں ضروری ہے کہ:

١۔ جس چیز کے عوض فیس لی جا رہی ہو وہ کوئی جائز خدمت ہو۔

٢۔ معلوم ہو۔

٣۔ خدمت مہیا کرنے والے کے ذمہ پہلے سے لازم نہ ہو۔

٤۔ فیس کی مقدار بھی معلوم ہو۔

٥۔ کسی کو اس معاملہ پر مجبور نہ کیا جائے۔

داخلہ فیس لینے کا حکم

بیشتر اداروں میں داخلہ فیس کے نام سے کچھ رقم لی جاتی ہے، داخلہ فیس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اصولی بات یہ ہے کہ داخلہ فیس درحقیقت ان خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے جو ادارہ کی طرف سے داخلہ کاروائی کے دوران امیدوار کو فراہم کیں جاتی ہیں، لہٰذا اگر ایسی کوئی خدمات مہیا کیں جائیں اور اس کے بدلے فیس کے نام سے کچھ معین رقم وصول کی جائے تو گنجائش ہے ورنہ نہیں، یاد رہے کہ صرف داخلہ کی بات طے کرنا کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس پر فیس لی جائے کیونکہ یہ خود عقد کا حصہ ہے۔

چھٹیوں کے دنوں کی فیس لینا

تعطیلات کے ایام میں جب تعلیم نہیں ہوتی تو فیس لینے کا بھی استحقاق پیدا نہیں ہوتا، البتہ اگر داخلہ کے وقت ہی طالب علم سے بات کی جائے کہ شعبان ورمضان کے دو مہینوں میں چھٹیاں مع فیس ہوں گی تو اس تاویل کے ساتھ گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ تعطیلات کے ان دنوں کو تعلیم کے دنوں کے تابع قرار دیا جائے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ ان مستقل تعطیلات کے عنوان سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، اگر ضرورت ہو تو دیگر مہینوں کی فیسوں میں اس لحاظ سے اضافہ کر دیا جائے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

لو قال يعطىٰ المدرس كل يوم كذا فينبغي أن يعطىٰ ليوم البطالة المتعارفة بقرينة ما ذكره في مقابله من البناء علىٰ العرف، فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ، وكذا لو بطل في يوم غير معتاد لتحرير درس إلا إذا نص الواقف علىٰ تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه كما قلنا. وفي الفصل الثامن عشر من التتارخانية قال الفقيه أبو الليث ومن يأخذ الأجر من طلبة العلم في يوم لا درس فيه أرجو أن يكون جائزا.[١]

---

[١] رد المحتار ،كتاب الوقف،ج٤ص٣٧٢.

فیس کی کچھ ناجائز شکلیں

اگر فیس لینے میں درج بالا شرائط کا لحاظ نہ رکھا جائے تو درست نہیں، مثلاً بعض اداروں میں اگر کوئی طالب علم انعام پائے تو انعام فیس کے نام سے کچھ رقم لی جاتی ہے، اس فیس کے عوض طالب علم کو کیا ملتا ہے؟ اگر انعام کے طور پر دی جانے والی چیز کو عوض قرار دیں تو اس میں جبر کرنا جائز نہیں، اگر انعام کی خوشی میں طالب علم سے اکرام وصول کرنا مقصود ہو تو بھی جبر کرنے کی اجازت ہے نہ ہی شرماشرمی میں کچھ لینے کی رخصت ہے، اس کے علاوہ کوئی عوض طالب علم کو نہیں ملتا، لہٰذا اس نام پر بلا عوض فیس وصول کرنے کا کوئی استحقاق نہیں۔

اسی طرح بعض اداروں میں ترقی فیس کے نام سے کچھ رقم وصول کی جاتی ہے، اگر کوئی طالب علم محنت کرنے کے بعد ذی استعداد طلباء میں شمار ہونے لگے یا امتحان میں انعام وصول کرنے کے بعد ممتاز اور انعام یافتہ طلبہ میں گنا جانے لگے تو بعض جگہ ترقی فیس کے نام پر اس سے کچھ رقم وصول کی جاتی ہے، حالانکہ اس کے بدلے طالب علم کو کوئی خاطر خواہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

اسی طرح بعض اداروں میں مدرسہ سے سند وصول کرنے کی الگ سے سند فیس وصول کی جاتی ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مدرسہ کے ضابطہ کے لحاظ سے سند لینا طالب علم کا حق نہ بنتا ہو تو سند دینے پر کچھ مقرر رقم "سند فیس" کے نام سے وصول کرنا جائز ہے ورنہ نہیں، مثلاً اگر کسی طالب علم نے ایک مدرسہ سے وفاق المدارس کا امتحان دیا اور وفاق کی طرف سے اس طالب علم کا سند مدرسہ پہنچ گیا تو اہل مدرسہ اس سند کے عوض کوئی فیس وصول نہیں کرسکتے، کیونکہ یہ سند مدرسہ کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی حیثیت

امانت کی ہے جو مالک کو دیدینا لازم ہے اور اس پر معاوضہ وصول کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

فیس کے طور پر زکوۃ دینا

اس کی مختلف صورتیں ہیں جن کا حکم بھی مختلف ہے، مثال کے طور پر زید ایک ادارے کا طالب علم ہے، مہینہ گزرنے کی وجہ سے اس پر فیس لازم ہوئی اور اب وہ چاہتا ہے کہ فیس کے نام سے اپنی واجب زکوۃ کی رقم ادارے میں دیدے، یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اس نے زکوۃ کی رقم سے اپنا دین چکایا جبکہ زکوۃ کی رقم معاوضہ کے طور پر دینا درست نہیں، اس سے زکوۃ اداء نہیں ہوتی۔

خالد ایک غریب طالب علم ہے اس پر مدرسہ یا کسی دوسرے ادارے کی طرف سے کئی مہینوں کی فیس باقی ہے، عمر چاہتا ہے کہ اپنی زکوۃ کی رقم خالد کی طرف سے اس کے فیس کے طور پر ادارے میں جمع کرے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر خالد مستحق زکوۃ ہو اور اس کے کہنے سے عمر رقم جمع کرائے تو گنجائش ہے اور زکوۃ ادا ہو جائے گی۔

فیس کے رقوم کا مصرف

فیس کے نام سے جو کچھ رقم کسی ادارے میں جمع ہو جائے اس کا مصرف کیا ہے؟ کیا ادارے والے اس کو ذاتی ضروریات میں صرف کرنے کے مُجاز ہیں یا اس ادارے کے مصالح ہی میں خرچ کرنا ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر موقوف ہے کہ اس رقم کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اگر فیس میں اجرت ہی کا پہلو نمایاں ہو تو یہ رقم ادارے کی ملک ہے اور اگر چندہ کی حیثیت غالب ہو تو جس نام وعنوان سے وصول کی جائے اسی میں خرچ کرنا لازم ہے۔

اگر معاملہ کرتے وقت طے ہو جائے کہ طلبہ کو تعلیم وغیرہ خدمات فراہم کی جائیں گی اور اس کے بدلے اتنی رقم لی جائے گی تو یہ اجرت شمار ہوگی جس کے وصول کرنے کا جبری مطالبہ بھی کیا جاسکتا ہے اور اگر معاملہ کی نوعیت ایسی نہ ہو بلکہ طلبہ اور ان کے سرپرستان وغیرہ سے الگ طور پر مدرسہ کے لئے کچھ رقم دیدینے کی اپیل کی جائے اور تعارف وترغیب کے لئے تعلیم وغیرہ ان خدمات کا ذکر کیا جائے جو طلبہ کو مہیا کی جاتی ہیں تو اس کی نوعیت چندہ کی ہوگی جس کے وصول کرنے میں جبر سے کام لینا جائز نہیں۔

فیس کے باوجود چندہ لینا

اگر کسی دینی ادارے میں فیس لینے کا ضابطہ ہو اور اس کے باوجود چندہ کی ضرورت محسوس ہو تو چندہ کرنے کی گنجائش ہے، محض فیس لینے کی وجہ سے چندہ جمع کرنا ناجائز نہیں ہوتا، تاہم یہ ضروری ہے کہ چندہ کی شرائط وضوابط کا لحاظ رکھا جائے اور غلط بیانی سے گریز کرلیا جائے۔

لیٹ فیس وصول کرنا

لیٹ فیس کی دو صورتیں ہیں:

الف: پہلی صورت یہ ہے کہ ہر ہر ماہ کی مستقل فیس مقرر کی جائے اور پھر تاخیر سے ادائیگی کرنے کی وجہ سے جرمانہ لگایا جائے، مثلاً کسی ادارے کا ضابطہ ہے کہ طالب علم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پانچ سو (٥٠٠) روپے فیس دے گا اور اگر کسی مہینہ وہ فیس نہ دے سکا تو اگلے مہینہ تین گنا فیس دے گا ایک سابقہ مہینہ کی، ایک اسی حالیہ مہینہ کی اور ایک بطورِ جرمانہ۔ لیٹ فیس کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ مقررہ تاریخ کو یہ رقم طالب

علم کے ذمہ ادارے کا دین بنا اور دین کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ وصول کرنا سود ہے جو کہ ناجائز اور حرام ہے۔

ب: دوسری صورت یہ ہے کہ شروع ہی سے یہ ضابطہ بنایا جائے کہ جو شخص فلاں تاریخ تک داخلہ کرے گا اس کی فیس اتنی ہو گی اور جو اس کے بعد فلاں تاریخ تک کرے گا اس کی فیس دوگنا ہو گی، یہ صورت شرعاً جائز ہے، "درر وغرر" میں ہے:

وحد (صح ترديد الأجر بالترديد في العمل) نحو إن خطته فارسيا فبدرهم، وإن خطته روميا فبدرهمين (وزمانه) نحو إن خطته اليوم فبدرهم، وإن خطته غدا فبنصفه.[1]

"فتاویٰ شامی" میں ہے:

(وصح ترديد الأجر بالترديد في العمل) كإن خطه فارسيا بدرهم أو روميا بدرهمين (وزمانه في الأول)..قال شيخنا الرملي: ومعناه يجوز في اليوم الأول دون الثاني كإن خطه اليوم فبدرهم أو غدا فبنصفه.[2]

ہمارے ہاں وفاق المدارس العربیۃ کے امتحانی نظم میں بھی یہی طریقہ کار ہوتا ہے کہ پہلے سے ایک تاریخ مقرر کی جاتی ہے جو طالب علم / ادارہ اس وقت اپنا فارم وغیرہ کوائف بھیج کر داخلہ کرتا ہے اس سے ایک فیس لی جاتی ہے اور جو اس کے بعد داخلہ کرنا چاہتے ہیں ان سے دوگنی فیس وصول کی جاتی ہے، اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

---

[1] الدرر والغرر ،كتاب الإجارة، ج٢ص٢٣٧.

[2] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الإجارة، ج٦ص٧٢.

مدرسہ کامال بینک میں رکھنا

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھنے کی حیثیت شرعاً قرض کی ہے اور وقف مال کو عام حالات میں قرض پر دینا شرعاً جائز نہیں ہے تاہم اگر قرض دینے میں وقف کی مصلحت ہو کہ مثلاً فی الحال وقف ادارے میں رقم کی ضرورت نہ ہو اور یوں ہی رقم رکھنے کی بنسبت قرض دینے میں حفاظت کا سامان زیادہ ہو تو ایسی صورت میں قرض دینے میں مضائقہ نہیں ہے، بینک میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جو مال وہاں کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کیا جاتا ہے وہ بالکل محفوظ رہتا ہے، لہٰذا اگر کسی مدرسہ کے پاس اس کی موجودہ ضروریات سے زائد رقم موجود ہو تو اس کو مدرسہ کی مصالح کے پیش نظر بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھنے کی گنجائش ہے تاہم سودی بینکوں میں رقم رکھنے سے یہی بہتر ہے کہ غیر سودی بینکوں میں رقم رکھی جائے، "جامع الفصولین" میں ہے:

"فصط خ": ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله ولا إقراضه فلو أقرض ضمن وكذا المستقرض وذكر ان القيم لو أقرض مال المسجد ليأخذه عند الحاجة وهو أحرز من إمساكه فلا بأس به. "عده": يسع المتولي إقراض ما فضل من غلة الوقف لو أحرز ولو استقرض الوصي من مال اليتيم ضمن وعن "م" رحمه الله لا يضمن كالأب.[١]

"مجمع الضمانات" میں ہے:

---

[١] جامع الفصولين،الفصل السابع والعشرون في تصرفات الأب والوصي والقاضي والمتولي، ج٢ص١٠.

ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله، ولا إقراضه فلو أقرض ضمن، وكذا المستقرض، وذكر أن القيم لو أقرض مال المسجد ليأخذه عند الحاجة، وهو أحرز من إمساكه فلا بأس، وفي (عده) يسع المتولي إقراض ما فضل من غلة الوقف لو أحرز.[1]

بنات کے مدارس کا حکم

قرآن وحدیث کی مختلف نصوص میں عورت کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کے اندر رہیں ،بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلے چنانچہ سورۃ احزاب میں ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہنّ) کو مخاطب بناکر مسلمان خواتین کو حکم دیا گیا کہ " وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ" احادیث مبارکہ میں بھی عورتوں کو یہی تعلیم دی گئی کہ خاتون چھپانے کی چیز ہے اس کو گھر کے اندر ہی رہنا چاہئے ،ترمذی کی روایت ہے:

عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان.[2]

ان نصوص کے پیش نظر خواتین کو چاہئے کہ عام حالات میں گھر کے اندر رہیں ، اسی میں عورت کے مال وعصمت کا بھی تحفظ ہے اور معاشرہ کا،اور بلا کسی حاجت کے گھر سے نکلنا گو مکمل پردے کی پابندی کے ساتھ ہی ہو،بالکل پسندیدہ نہیں ہے اس میں بہت سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے جس کی طرف کچھ اشارہ مندرجہ بالا حدیث میں بھی کیا گیا۔

---

[1] مجمع الضمانات،ج١ ص٣٣٣.

[2] سنن الترمذي،ابواب الرضاع، رقم الحديث: ١١٧٣.

لہٰذا اگر کسی عورت کے لئے گھر کی چار دیواری ہی میں یہ نعمت میسر ہو کہ وہ اپنی ضرورت کی حد تک دینی علم وتربیت حاصل کر سکتی ہے تو اس کے لئے اس مقصد کے لئے گھر چھوڑ کر باہر جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، جس طرح عورت کی بہتر نماز وہ ہے جو گھر کے بالکل تنہائی میں پڑھی جائے یوں ہی بہتر تعلیم وعلم وہی ہے جو گھر کے اندر رہ کر حاصل کیا جائے۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ عصر حاضر میں دینی علوم واحکام سے غفلت اور دوری بہت زیادہ ہے، طلوع اسلام کے بعد سے آج تک کسی دور میں دین اسلام اور اس کے احکام وفرائض کے متعلق اتنی سستی، جہالت اور بے راہ روی دیکھنے کو نہیں ملتی جتنی آج مشاہدہ میں آتی ہے اور دینی احکام کے متعلق ان تمام خرابیوں کی ایک بڑی بنیاد جہل بھی ہے پھر عورتوں کا دینی احکام سے جاہل رہنا اس اعتبار سے مردوں کی بنسبت زیادہ خطرناک ہے کہ بچوں کی تربیت کا بڑا حصہ عورت کے ہی زیر کفالت ہوتا ہے اور عورت جاہل ہو تو اس کے تحت نشو نما پانے والے معصوم بچے بھی یوں ہی بے راہ روی، آوارگی اور بداخلاقی کے شکار ہوں گے اور یوں معاشرتی بگاڑ زیادہ ہوتا جائے گا، اس خطرے پر قابو پانے کے لئے عورتوں کے دینی احکام وفرائض سے روشناس کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ساتھ یہ بات بھی یقینی ہے کہ مردوں کی بنسبت عورتوں کے لئے ان جیسے انتظامات کرنے میں نزاکت اور ذمہ داریاں بھی بہت ہے چنانچہ اس میں شرعی پردہ وغیرہ کی رعایت رکھنا بھی لازم ہے۔

ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے بنات کے لئے مدارس بنانے کی ضرورت واہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور ساتھ اس کی نزاکت اور اس حوالہ سے ارباب

انتظام کی بڑھتی ذمہ داریاں بھی، لہٰذا بنات کے مدارس میں مندرجہ ذیل باتوں کی پوری پابندی کرنا لازم ہے:

۱۔ مہتمم / منتظم میں ایسے مدارس چلانے اور اس کو شرعی احکام کے مطابق استوار رکھنے کی صلاحیت ہو، جس کی تفصیل اسی کتاب کے باب دوم میں ذکر ہو چکی ہے۔

۲۔ شرعی حجاب کی پوری پابندی اور کڑی نگرانی ہو، بنات کے گھر سے نکلنے سے لے کر مدرسہ آنے، پڑھنے اور واپس گھر پہنچنے تک کسی بھی مرحلہ پر کسی طرح بے پردگی کا اندیشہ نہ ہو۔

۳۔ آنے جانے، پڑھنے یا مدرسہ کے اندر رہنے میں مردوں کے ساتھ کسی طرح اختلاط نہ ہو۔

۴۔ شادی شدہ نہ ہو تو باپ ورنہ تو شوہر کی اجازت بھی ہو، عام حالات میں شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا ناجائز ہے۔

"فتاویٰ قاضی خان" میں ہے:

وإذا أرادت المرأة أن تخرج إلىٰ مجلس العلم بغير إذن الزوج لم يكن لها ذلك فأن وقعت لها نازلة فسألت زوجها وهو عالم فأخبرها بذلك ليس لها أن تخرج بغير إذنه وأن كان الزوج جاهلاً وسأل عالماً عن ذلك فكذلك وأن امتنع الزوج عن السؤال كأن لها أن تخرج بغير إذنه لأن طلب العلم فيما يحتاج إليه فرض علىٰ كل مسلم ومسلم فيقدم علىٰ حق الزوج وأن لم يقع لها نازلة وأرادت أن تخرج علىٰ مجلس العلم لتتعلم مسائل الصلاة والوضوء فأن كأن الزوج يحفظ تلك المسائل ويذكر لها ذلك ليس لها أن تخرج بغير إذنه فأن

كأن الزوج لا يحفظ المسائل فالأولى له أن يأذن لها بالخروج فأن لم يأذن فلا شيء عليه ولا يسع لها أن تخرج بغير إذنه ما لم يقع لها نازلة.[1]

۵۔نکلتے وقت خوشبو لگانے اور ایسے زیورات استعمال کرنے سے احتراز کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے آتے جاتے وقت لوگوں کی توجہ اس کی طرف پھرے۔

٦۔اگر مدرسہ مسافت سفر پر ہو تو شوہر یا محرم بھی ساتھ ہو۔

علامہ ابن الہمام عورت کے گھر سے نکلنے کے متعلق ایک مفید علمی بحث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وحيث أبحنا لها الخروج فإنما يباح بشرط عدم الزينة وتغيير الهيئة إلى ما لا يكون داعية إلى نظر الرجال والاستمالة، قال الله تعالى {ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى}.[2]

مدارس البنات میں قابلِ اصلاح امور

ان شرائط کے ضمن میں جو شرعی حجاب کی قید لگائی گئی ہے اس سے صرف جسم وچہرہ کا پردہ کرنا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ سلام وکلام اور ربط وتعلق ساری باتیں اس میں داخل ہیں، لہٰذا ارباب انتظام یا معلم حضرات کا نامحرم بنات کے ساتھ سلام وکلام کرنا، بلا ضرورت ان کے ساتھ موبائل رابطہ رکھنا بھی جائز نہیں ہے، اگر طالبات سے سبق سنوانے یا عبارت پڑھوانے کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے لئے معلمات کا انتظام کرلینا

---

[1] فتاوى قاضيخان، كتاب النكاح، فصل في حقوق الزوجية، ج١ص٢١٧.

[2] فتح القدير، باب النفقة، ج٤ص ٣٩٩.

چاہئے اور معلمات بھی ایسی ہوں جو سبق سمجھنے کے ساتھ ساتھ نیک صالح اور تربیت یافتہ بھی ہوں کیونکہ نامحرم خواتین کے ساتھ بے تکلف اور بے ضرورت بات چیت کرنے سے گریز کرنا ضروری ہے۔

درمختار وشامی میں ہے:

ولا يكلم الأجنبية إلا عجوزا عطست أو سلمت فيشمتها لا يرد السلام عليها وإلا لا انتهى.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله وإلا لا) أي وإلا تكن عجوزا بل شابة لا يشمتها، ولا يرد السلام بلسانه.[1]

یہاں "عجائز" کو اگرچہ استثناء کیا گیا ہے تاہم بہت سے متاخرین فقہاء نے بلا استثناء ان باتوں کی ممانعت فرمائی ہے کیونکہ ایک تو "لکل ساقطۃ لاقطۃ" کا ضابطہ ہے، ساتھ یہ بھی ہے کہ دینی مدارس دین کے سیکھنے اور عملی طور اس کی تربیت دینے کی جگہ ہے وہاں عام مسائل میں عموماً اور پردے وغیرہ کے مسائل میں خصوصاً احتیاط کا رویہ استعمال کرنے کی اجازت ہے، نیز مستقل طور پر اس طرح گنجائش دینے میں متعدد مفاسد جنم لینے کا خدشہ ہے اس لئے کم از کم دینی مدارس کی حد تک اس سے مکمل گریز واحتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

بنات کے مدارس میں حیض ونفاس کے احکام کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے لہٰذا تعلیم وتدریس ہو یا امتحان، کسی بھی موقع پر حیض کی حالت میں کسی طالبہ کو قرآن کریم کی رواں تلاوت پر مجبور نہ کیا جائے نہ ہی ایسی کسی کوتاہی کو مطلع ہونے کے باوجود

---

[1] الدر المختار، كتاب الحظر والاباحة، فصل في النظر والمس، ج٦ص ٣٦٩.

برداشت کیاجائے بلکہ بروقت اس کی اصلاح کرنی ضروری ہے، بنات کے اکثر مدارس میں فیس لیکر تعلیم دینے کا نظم ہوتا ہے ، فی نفسہ فیس لیکر پڑھانے میں مضائقہ نہیں ہے تاہم چونکہ اس کی وجہ سے یہ معاملہ عقد اجارہ بن جاتا ہے لہٰذا اس میں ایک تو اجارہ کے احکام کی رعایت رکھنی ضروری ہے اور ساتھ چندہ وغیرہ میں بھی شرعی احکام کی پابندی کرنے کی ضرورت ہے۔

****

باب ششم:

- ✓ اصول ہشتگانہ کا تعارف
- ✓ دینی مدارس کے کامیابی اور ناکام ہونے کے اسباب اور ان کا سدّباب
- ✓ ضمیمہ: کھانا جمع کرنے کے لیے طلباء کو گھر گھر بھیجنا

اصول ہشتگانہ کا تعارف

برصغیر پاک وہند کے مدارس میں "دار العلوم دیوبند" کو علمی، سیاسی اور تاریخی غرض ہر لحاظ سے ایک بنیادی مقام حاصل ہے، اس عظیم مدرسہ کے بانی حضرت علامہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اس "مدرسہ" کے لئے آٹھ اصول طے فرمائے تھے جن کو "اصول ہشتگانہ" کہا جاتا ہے، ان اصولوں پر پوری اہتمام کے ساتھ عمل ہوتا رہا اور بار بار ان اصول کی افادیت محسوس کی گئی۔ یہاں انہی اصول کو مختصر تشریح و توضیح کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے[1]۔

پہلا اصل اور اس کی شرح

"ا: تابمقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کوشش کروائیں؛ خیر اندیشانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔"

شرح: تکثیرِ چندہ بقائے مدرسہ کا ایک ظاہری سبب ہے، اسی لئے اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی تاکید کی جارہی ہے۔ اس ضمن میں بقائے مدرسہ اور استحکام مدرسہ کے تمام جائز اسباب داخل ہیں، چاہے وہ ظاہری ہوں یا روحانی اور حقیقی۔ عوامی چندہ میں دیگر فوائد کے ساتھ ایک فائدہ عوام کا بھی ہے کہ ان کے ساتھ اہل دین کا ربط و تعلق پیدا ہو جائے گا اور معاشرے میں دینی فضاء کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں یہی اختلاط ہی اہم اور مفید عنصر ہے۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ مال خرچ کرنے کے بعد اہمیت کا

---

[1] حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" ص۸۹ میں ان اصول کی کچھ وضاحت فرمائی ہے، اس کی طرف بھی مراجعت کی جاسکتی ہے۔ نیز مولانا عبید اللہ سندھی صاحب مرحوم کی کتاب "برصغیر میں تجدید دین کی تاریخ" ص۲۸۷ کی طرف مراجعت کرنا بھی شاید مفید ثابت ہو۔

احساس بھی شروع ہو جاتا ہے تو چندہ فراہم کر دینے سے عام معاشرے میں دینی اداروں کی قدر دانی بھی پیدا ہو گی اور یوں ہر طرح دینی ماحول بیدار ہو جائے گا۔

یہاں ابتدا میں "تا بمقدور" کی قید لگائی گئی ہے یعنیٰ قدرت واستطاعت کی حد تک تکثیر چندہ کی فکر کی جائے، اور قدرت جس طرح حسی وظاہری ہوتی ہے یوں ہی شرعی و حکمی بھی ہوتی ہے لہٰذا چندہ کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنا ممنوع ہے اور ایسے وسائل اختیار کرنے سے بھی سخت اجتناب وگریز کرنا ضروری ہے جس سے دین یا اہل دین کی بدنامی کا قوی اندیشہ ہو۔

دوسرا اصل اور اس کی شرح

"۲: ابقائے طعامِ طلبا، بلکہ افزائش طلبا میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔"

شرح: مدرسہ کا ایک بڑا مقصود یہی طلبہ دین کی تعلیم وتربیت ہے، اس لئے ایک تو خود طلبہ کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر طالب علم نہ ہوں تو کس کو تعلیم دی جائے گی؟ اگر کم ہو تو بھی معاشرے کی ضرورت پوری نہ ہو گی کیونکہ معاشرے میں دینی اقدار کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ افراد کار بقدر ضرورت مہیا کئے جائیں۔ طلبہ کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام کر دینا بھی حد درجہ مفید ہے کہ وہ اس طرح سب جہات سے یکسو ہو کر دینی علوم کی طرف متوجہ ہوں گے اور کم وقت میں زیادہ کام ہو جائے گا۔

تیسرا اصل اور اس کی شرح

"۳: مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانہ خواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو

اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائیوں کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبیِ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔"

اور اس لیے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بہ دل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں، یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدارِ معتد سے مشورہ کیا گیا ہو، تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔"

شرح: اس اصل سے درجِ ذیل ہدایات معلوم ہو جاتی ہیں:

۱۔ مدرسہ کا نظم شورائی ہو۔ ذاتی اور شخصی نوعیت کا مدرسہ نہ ہو کہ صاحب اہتمام جو کچھ چاہے، کرے۔

۲۔ مشورہ دینے کا مقصد مدرسہ کی خوشحالی اور ترقی ہو۔ ذاتی امارت اور وجاہت برقرار رکھنا اور ان جیسے دیگر محرکات کی بناء پر مشوروں کا لین دین اور تبادلہ خیال نہ ہو۔

۳۔ اہل مشورہ اپنی حقیقی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے رہیں، کسی خوف، طمع، اکثریت سے اتفاق، اختلاف اور شرما شرمی یا ان جیسے دیگر عوامل کی بنیاد پر اپنی واقعی رائے کے اظہار میں بالکل پس و پیش سے بالکل کام نہ لیں۔

۴۔اگر کہیں کسی رکن کے مشورہ پر عمل نہیں ہوا یا ان سے مشورہ کرنے کی ہی نوبت نہیں آسکی تو کبیدہ خاطر نہ ہو۔

۵۔مدرسہ کے امور میں انہی افراد سے مشورہ کیاجائے جن میں درجِ ذیل تین صفات جمع ہوں:

الف:ذی علم ہو یعنیٰ بقدرِ ضرورت علم دین حاصل ہو۔(کم از کم یہ ہے کہ جس قضیہ کے بابت مشورہ ہو،اس کے تمام پہلوؤں پر کے احکام معلوم ہوں۔)

ب:ذی عقل وہوشیار ہو۔دور اندیش ہو۔

ج:خیر اندیش ہو۔مدرسہ کی بھلائی اور خیر وفلاح دل سے چاہتا ہو۔اگر مدرسہ کا خیر خواہ نہیں ہو گا تو اس کا مشورہ مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

ان تینوں شرائط کی حیثیت قید احترازی کی ہے،لہٰذا اگر کسی شخص میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے اور مدرسہ کے مستقل شوریٰ اراکین میں ایسے شخص کو دخل نہیں دینا چاہئے۔

یہ اس اصل سوم کے مندرجات ہیں،اب جن ضروری مقدمات پر یہ مندرجات موقوف ہوں،ان کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور اس اصل کے تحت "اقتضاء النص" کے طور پر وہ باتیں بھی داخل ہیں۔ایسی تمہیدی باتیں تو متعدد ہیں لیکن بنیادی طور پر دو عناوین کے تحت ان کو سمیٹا جاسکتا ہے کہ اراکین شوریٰ تعلیم اور تربیت یافتہ ہوں۔لہٰذا ضروری ہے کہ:

الف: مدرسہ کا نظم شورائی ہو۔ب:تمام اہم امور باہم حقیقی مشورہ سے طے ہوتے ہوں۔ج:اراکین شوریٰ تعلیم اور تربیت یافتہ ہوں ۔د: مشورہ کے لئے ایسا ماحول

بنایا جائے جہاں ہر رکن اپنی حقیقی رائے کا آزادانہ اظہار کرے اور اپنی ہی بات کو منوانے پر اصرار نہ کرے۔

چوتھا اصل اوراس کی شرح

"۴: یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روز گار خود بیں اور دوسروں کے درپہ نہ ہوں، خدانہ خواستہ جب اس کی نوبت آئے گی پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔"

شرح: مشرب کسی چیز کو پینے یا پینے کی جگہ کو کہا جاتا ہے، جہاں سے روحانی اور علمی غذا حاصل کرنے کی توفیق ہوجائے ،اس کو بھی مشرب سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔ مشرب کے اتفاق واتحاد سے بڑی حد تک مزاج ومذاق میں یکسانیت ویگانت پیدا ہوجاتی ہے اور یہاں یہی مراد ہے، گویا یہاں ملزوم یا سبب کو ذکر کیا گیا ہے اور اس سے لازم یا مسبب مراد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ذوق ومزاج ایسی چیز ہے جس کے تمام تر جزئیات میں اتحاد واتفاق نہ صرف غیر ضروری بلکہ بڑی حد تک مشکل بھی ہے۔ یہاں بس اس حد تک اتفاق واتحاد ضروری ہے کہ:

الف: سب مدرسین کے نظریات وافکار ایک جیسے ہوں۔

ب: سب کے مقاصد واہداف ایک جیسے بلکہ ایک ہوں۔

ج: ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت واستعداد رکھتے ہوں۔

تمام مدرسین کا مشرب کے لحاظ سے متفق ہونا ایک کامیاب ادارے کے لئے ضروری ہے،ورنہ مدرسہ، مدرسین اوراس کے طلبہ کے افکار ومشاغل میں انتشار واختلاف پیدا ہوگا جو کسی بھی ادارے کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پانچواں اصل اوراس کی شرح

"۵:خواندگیِ مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز سے مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہو گا اور اگر ہو گا تو بے فائدہ ہو گا۔"

وضاحت:اس اصل پر عمل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کار اور کہنہ مشق مدرسین کے باہم مشاورت سے یہ تحریری طور پر طے کر دیا جائے کہ کونسی کتاب کتنی مدت میں کتنی پڑھائی جائے گی؟ مثال کے طور پر ماہانہ جائزہ یا سہ ماہی امتحان کی ترتیب پر مقدارِ خواندگی طے کریں کہ فلاں کتاب ماہانہ جائزہ یا سہ ماہی امتحان تک فلاں باب یا فصل تک پڑھائی جائے گی۔ نصاب کو پورا پڑھانے کے لئے یہ تجویز بہت مناسب ہے ورنہ ہوتا یوں ہے کہ تعلیم کا دورانیہ پورا ہو جاتا ہے لیکن نصاب ابھی پورا نہیں ہوتا، اب یا تو یوں ہی ادھوری کتاب رہ جاتی ہے اور بہت سے ضروری ابواب وفصول بھی طلبہ کے سامنے نہیں آتے اور یا صرف ورق گردانی پر اکتفاء کر لی جاتی ہے جس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

چھٹا اصل اوراس کی شرح

"۶:اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہوتی جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرطہ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یہ خوف ورجاجو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔"

توضیح: اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ مدرسہ بلکہ کسی بھی دینی خدمت انجام دینے والے ادارے کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی آمدنی کا کوئی یقینی راستہ مقرر نہ ہو بلکہ اس باب میں کسی حد تک بے سروسامانی کی فضاء برقرار رکھنی مناسب ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ دینی کام خواہ کسی بھی شکل ہو، وہ اسی وقت مکمل طور پر بار آور ثابت ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اوراس کے ساتھ غیر معمولی ربط و تعلق ہو اور تعلق عام طور پر اسی وقت استوار رہتا ہے جبکہ ضرورت درپیش ہوتی رہے ورنہ استغناء کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس میں انسان عام طور پر اعراض وغفلت کا شکار ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اسباب پر گھمنڈ کرنے کی بھی نوبت آ پہنچتی ہے جس کا مضر ہونا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

البتہ متن میں "ایک نوع کی بے سروسامانی" کا ذکر ہے اور یہی ضروری ہے، بات بات میں بے سروسامانی کی فضاء قائم رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات ضر رساں ثابت ہو جاتا ہے خصوصاً جب متعلقہ افراد توکل کے کسی اونچے مقام تک نہ پہنچے ہوں اور عموماً لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ صرف سرمایہ اور تعمیر کی حد تک انتظام کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ ارباب مدارس کے ہاں رجوع الی اللہ کا اہتمام رہے اور کسی بھی اہم اقدام واحجام میں اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو۔ نیز ربط و تعلق بر قرار تب رہتا ہے جبکہ اس کے منافی امور سے اجتناب ودوری ہو، اور منافی امور چیزیں یہی خلاف شرع امور ہیں جن کو معاصی ومنکرات سے تعبیر کیا جاتا ہے، لہٰذا مدرسہ اور کسی بھی دینی ادارے میں گناہوں اور معاصی کا ماحول نہیں ہونا چاہئے۔

ساتواں اصل اوراس کی شرح

"۷: سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔"

توضیح: سرکار اور مالدار لوگوں کی شرکت مضر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مدرسہ کے مختلف امور میں اثر انداز ہونا چاہتے ہیں اور یہ ریاستی اور مالداری کا طبعی اثر ہوتا ہے جس کا بارہا تجربہ ہوچکا ہے۔شرکت مال وچندہ حاصل کرنے میں بھی ہوتا ہے اور مشاورت واختیارات وغیرہ میں بھی، کہ کسی نواب ورئیس یا سرکاری عہدیدار کو اسی عہدے کی نسبت سے مجاز یامؤثر رکن شوریٰ منتخب کیاجائے اور یہ بھی شرکت کی ایک مضر صورت ہے کہ بار بار ان کو تقریب میں نمایاں مقام ومرتبہ دیاجائے۔

یادرہے کہ خواہ مخواہ کسی سے بدگمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مالدار لوگوں کو دینی خدمت کے مواقع سے محروم کرنا مقصود ہے بلکہ اصل ہدف یہ ہے کہ مدرسہ کے امور سے ناشناس لوگ کے ہاتھ میں مدرسہ کے امور کی تکمیل نہ دی جائے ورنہ انجام کار مدرسہ کا مقصود ہی ختم ہوجائے گا۔

ندوۃ العلماء کا ایک دلچسپ واقعہ

اس سلسلہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمہ اللہ نے ایک بڑا ہی دلچسپ قصہ لکھاہے،وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بعض ایسے نازک مرحلے بھی آئے جب ان ہی کی ذہانت ،حاضر جوابی اور موثر شخصیت نے عقدہ کشائی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانے میں ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہندوستان میں ایک نمونہ کی عربی درسگاہ قائم کرنا چاہتی ہے،جو ماڈل عربک کالج کے طور پر عربی مدارس کی رہنمائی اور قیادت کرے اور جس میں عربی زبان وادب

اور مشرقی علوم وفنون کی معیاری اور جدید اصولوں اور تجربات کے مطابق عصری تعلیم دی جائے۔ مولانا آزاد کے نزدیک (سابقہ تعلقات اور اپنی ذاتی واقفیت اور رجحان کی بناپر)اس کے لیے دارالعلوم سے زیادہ کوئی مدرسہ موزوں نہ تھا،انھوں نے فرمایا کہ اگر ندوہ العلماءکے ذمہ دار اس تجویز کو قبول کر لیں گے تو حکومت عمارتوں کی تکمیل کرادے گی۔یہ تجویز آئی تو ندوۃ العلماءکے ذمہ دار بڑی کشمکش میں پڑ گئے،ایک طرف دارالعلوم کے (ایک خاص مقصد کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے)موت وحیات کا مسئلہ تھا دوسری طرف مولانا کی تجویز کو یکسر رد کر دینا بھی مشکل تھا،جو ایک بزرگ خاندان کی حیثیت رکھتے تھے،اور بیشتر ارکان ندوہ کے بزرگ اور محترم تھے،ندوہ کے خادم وامین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس تجویز کو قبول کرنے کے بعد ندوہ ندوہ نہیں رہے گا،ایک عربک کالج بن جائے گا،اور ملت کے ہاتھ سے نکل جائے گا،آج مولانا آزاد وزیر تعلیم اور حکومت میں دخیل وموثر ہیں،وہ ندوہ کے مقاصد سے واقف بھی ہیں،اور ان کے ہمدرد بھی،کل ان کی جگہ پر کوئی اور آئے گا،اور اس وقت زمام اختیار بالکل ہاتھ سے نکل چکی ہو گی۔اس لیے اس تجویز کو منظور کرنا تحریک ندوۃ العلماء کے محضر قتل پر دستخط کرنے کی مرادف ہے،لیکن مولانا آزاد سے اس مسئلہ پر کون بات کرے اور مخمصہ سے نکلنے کی سبیل کیسے نکالی جائے؟

آخر قرعہ فال مولانا مسعود علی صاحب کے نام نکلااور یہ مشکل کام ان کے سپرد ہوا کہ وہ دہلی جائیں،اور مولانا آزاد سے اس مسئلہ میں ایسی گفتگو کریں کہ ان کے اس جذبہ کی ناقدری بھی نہ ہو اور معذرت بھی ہو جائے۔ آگے کی سر گزشت مولانا نے خود سنائی ،فرماتے تھے کہ میں گیاتو پہلا واسطہ مولانا کے پرسنل سکریٹری پروفیسر اجمل خاں سے پڑا،وہ ان کے مولانا کے تعلقات سے واقف نہ تھے،مولانانے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے کہا کہ ”مولانااس وقت بہت مصروف ہیں“وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے،وہیں انھوں نے چہل قدمی شروع کر دی،اجمل خاں نے پوچھا کہ آپ تشریف

کیوں نہیں لے جاتے ؟ کہنے لگے کہ میرے اور مولانا کے تعلقات کو نصف صدی کے قریب مدت ہو رہی ہے، میں اس کی جبلی منانا چاہتا ہوں، اس لیے مولانا سے تاریخ لینے آیا ہوں، اب وہ سمجھے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، اندر گئے اور مولانا کو اطلاع دی ، مولانا نے فوراً بلالیا اور اپنے معمول کے مطابق کہا کہ مولانا مسعود کیسے آئے ؟ کہنے لگے کہ کچھ بزرگوں کے لوح مزار کی عبارت کے بارے میں غور وخوض ہو رہا ہے، مولانا محمد علی مونگیری کے لوح مزار پر بانی ندوۃ العلماء لکھنا تجویز ہوا ہے، اسی طرح مولانا شبلی کے لوح مزار کی کوئی عبارت بتائی جس سے ان کی ندوۃ العلماء کی تحریک کو ترقی دینے کا اظہار ہو تا تھا، کہنے لگے کہ اندیشہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے لوح مزار پر قاتل ندوۃ العلماء لکھا جائے، اور ہم اس کے قاتل ٹھہریں، آج تو آپ منصب وزارت پر ہیں، اور آپ کی موجودگی میں اس کا خطرہ نہیں، لیکن کون آتا ہے اور کیا ہوتا ہے ؟ مولانا کی شہرہ آفاق ذہانت کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا، وہ دور تک بات کو سمجھ گئے اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا فیصلہ صحیح ہے ، اور اس تجویز پر کوئی اصرار نہیں ۔ مولانا مسعود صاحب کے پورے الفاظ تو یاد نہیں، اس قصہ کا خلاصہ یہی تھا، وہ وہاں سے کامیاب واپس آئے، اور یہ بات آئی گئی ہو گئی ۔"[1]

آٹھواں اصل اور اس کی شرح

"۸: تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔"

---

[1] پرانے چراغ، ج۲ص۹۵

شرح: اس سے معلوم ہوا کہ چندہ کی تحصیل میں صرف جائز وناجائز کے حدود کی ہی پابندی کافی نہیں ہے بلکہ مدرسہ کی ترقی اور کامرانی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے بڑھ کر بہتر اور غیر بہتر کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ لہٰذا:

الف: جن لوگوں سے چندہ لینے میں خطرہ ہو کہ وہ مدرسہ کے امور میں دخل اندازی کرنے لگے گے۔

ب: ان لوگوں کی آمدنی ہی مشکوک ومشتبہ ہو۔

ج: چندہ دینے کا مقصود ناموری ہو، نام وشہرت پیدا کرنے کے لئے مدرسہ کے ساتھ کوئی امداد وتعاون کرتے ہوں۔

د: چندہ لینے میں کوئی دینی مصلحت فوت ہو جاتا ہو، مثال کے طور پر کوئی دین بے زار فرد/ جماعت (کسی مقصد کے لئے) مدرسہ کے ساتھ علانیہ طور پر کوئی تعاون کرنا چاہے اور خطرہ ہو کہ اس کے تعاون کو قبول کرنے کی صورت میں لوگوں کی اس کے ساتھ ہمدردیاں پیدا ہو جائیں گی۔ تو ان جیسی صورتوں میں تعاون وصول کرنے سے احتراز ہی کرنا ضروری ہے، بعض صورتوں میں یہ احتراز فقہی طور پر واجب تو نہیں ہوتا، لیکن مدرسہ کی ترقی وکامرانی اور اس کے مؤثر ومثمر ہونے کے لئے بہر حال یہ احتیاط کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مدارس کے کامیابی اور ناکامی کے اسباب اور ان کا سدّباب

مدارس کے کامیابی اور ناکامی کا معیار

کسی چیز کے کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس چیز کا مقصود کیا ہے اور وہ کس حد تک مقصود حاصل ہو رہا ہے؟ مدارس کی ناکامی کا رونا اور گلی کوچے اس کا ڈھنڈورا پیٹنا آج کل ترقی پسندی کی نشانی اور روشن خیالی کا

شعار بنتا جارہا ہے، اس لئے اطراف واکناف سے اس کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور جگہ جگہ اس کے مرثیہ پڑھے جارہے ہیں لیکن ان میں سے اکثر تبصرے بالکل بے محل اور بے وقعت ثابت ہوتے ہیں جس کا ایک بنیادی منشا یہ بھی ہے کہ مدرسہ کا مقصود و محور پہچانا نہیں اور اپنی طرف سے اس کے مقاصد واہداف کی ایک فہرست وابستہ کردی اور پھر جب دیکھا کہ اس فہرست کے اکثر مندرجات پورے نہیں ہورہے ہیں تو جٹ سے بہانگ دہل یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ مدارس اپنے مقاصد کی تحصیل و تکمیل میں ناکام ثابت ہوئے۔

یاد رہے کہ ہم مدارس کی عصمت یا حفاظت کے مدعی ہیں اور نہ ہی اس میں کوتاہیوں اور کمزوریوں کے در آنے کے منکر ہیں بلکہ ہم جس طرح عصری اداروں کے انحطاط وزوال کا رونا روتے ہیں اور پوری خیر خواہی کے ساتھ اس کی اصلاح کی تمنا دل میں رکھتے ہیں ،یوں ہی مدارس کے خامیوں کے بھی ہم قائل بھی ہیں اوراس کی اصلاح ودرستگی کے لئے ایک حد تک کوشاں بھی۔ لیکن ہر چیز میں تحقیق، انصاف پسندی، سچائی اور اعتدال چاہتے ہیں۔

دینی مدرسے کا موضوع و مقصود

مدارس کا اصل موضوع اور بنیادی مقصد "دین اور اس کے احکام وشعار کا بقدر استطاعت تحفظ کرنا اوراس ضرورت کی تحصیل و تکمیل کے لئے معاشرے کو حسبِ ضرورت رجالِ کار فراہم کرنا ہے"۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام ارباب مدارس کی عقیدت ومحبت کے مرجع حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کو جب دیوبند میں مدرسہ قائم ہونے کی اطلاع ملی اور کہنے والے نے اپنی طرف نسبت کر کے عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، تو اس پر حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاءِ اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر[1]۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔"

عملی جائزہ

مدرسہ کے اس موضوع و مقصود کو سامنے رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ مقصود مکمل طور پر مفقود تو نہیں ہے بلکہ کافی حد تک موجود ہے (جس پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی شکر ہے) اور ابھی تک معاشرے میں جو کچھ دین و تدین کی فضاء قائم ہے اس میں مدرسہ کا اہم اور بنیادی کردار ہے، تاہم اس باب میں بہت سے کمزوریاں اور خامیاں بھی محسوس ہوتی ہیں جن سے آنکھیں چرانا خیر خواہی کے خلاف اور ترقی سے بڑا مانع ہے، اس لئے اس روش پر قناعت کرلینا بالکل مناسب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ اسباب و عوامل معلوم کرلئے جائیں جن کی وجہ سے یہ کمزریاں پیش آتی ہیں اور پھر ان عناصر کو ختم کرنے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کی جائیں جن کی وجہ سے مدارس کو اپنے نیک مقاصد میں کامیابی سے رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

اس موضوع پر متفرق اوقات میں مختلف حلقوں اور شخصیات کی طرف سے غور وخوض کیا گیا ہے اور متعدد بار اس کو انفرادی اور اجتماعی بحث و مباحثہ بنایا گیا ہے جس

---

[1] یہی بقاء اسلام اور تحفظ علم (دین)، جس کا مجموعی حاصل اور جامع عنوان تحفظ دین ہے، مدارس کا اصل مقصود ہے۔ مدارس کی معاشرے کو نفع رسانی کی صورت اور میدان یہی ہے۔ جب تک مدارس میں نفع رسانی کی یہ فضاء برقرار ہو، ترقی ہو گی اور جب خدا نخواستہ اس میں غفلت و نقصان غالب ہونے لگے تو پھر خطرہ ہے کہ مسلمان معاشرے اس عظیم نعمت سے محروم ہو جائے۔ قرآن کریم میں کیا ہی عجیب انداز میں فرمایا گیا:
{كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ} [الرعد: ۱۷]

کے نتیجہ میں بہت سے مفید تجاویز سامنے آئی ہیں۔ تاہم زیادہ طوالت سے بچنے کی خاطر ہم یہاں صرف ایک مضمون کے ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس سے کافی حد تک رہنمائی کا سامان ملے گا۔ یہ مضمون حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ نے ماہنامہ "الحق" کے سوالنامے کے جواب کے طور پر تحریر فرمایا تھا جو اس میں جولائی ۱۹۸۱ کو شائع ہوا۔ یہاں بعینہ اس کو نقل کیا جاتا ہے اور چونکہ یہ مسئلہ ایک مدت تک اس ناکارہ کے غور و فکر کا موضوع رہا ہے، اس لئے اس کے بعد آخر میں اپنے غور و فکر کا حاصل ذکر کیا جائے گا۔

مدارس کے انحطاط کے اسباب و تجاویز:

دینی مدارس کا انحطاط: اسباب اور علاج

دینی مدارس کے سلسلے میں ہمارے سوالات کے جواب میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور حضرت مولانا عبد الحق صاحب مد ظلہم کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ صحبتِ امروز میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی مد ظلہم کے گراں قدر افکار پیش کئے جارہے ہیں۔

ہمارے سوالات یہ تھے۔

۱۔ یہ ایک تاثر ہے کہ ہماری موجودہ دینی درس گاہوں سے مؤثر علمی و دینی شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے۔ جناب کی نظر میں اس کی اسباب کیا ہیں؟

۲۔ موجودہ دینی مدارس کو دوبارہ مردم خیز اور امت کے لئے زیادہ نفع بخش بنانے کے لئے کونسے اقدامات آپ کی نظر میں ضروری ہیں؟

۳۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے۔ براہِ کرم نشاندہی فرمائیں کہ آپ کی نظر میں یہ مقصد کیا

ہے؟اور اہلِ مدارس میں اس کا ایسا استحضار کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہو سکے؟

جواب سوالِ اول۔ یہ تاثر درست ہے کہ دینی درسگاہوں میں علمی و دینی شخصیتیں معیاری درجہ میں پیدا نہ ہو سکیں۔ میری رائے میں اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

ا۔ حقیقی سبب تعلق مع اللہ ہے۔ جو کہ تزکیہء قلب سے پیدا ہوتا ہے۔ علمِ دین عطیہ حق ہے، اس کا فیضان پاک ظرف میں ہوتا ہے۔ اس لئے تزکیہ کا ذکر قرآن نے تعلیم سے مقدم کیا ہے "یتلوا علیهم آیٰته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة"۔ اس کے علاوہ "لا یمسه الاالمطهرون" بھی اسی طرف مشیر ہے۔ کہ اگر قرآنِ ظاہری کے لئے طہارۃِ ظاہریہ ضروری ہے تو باطنِ قرآن یعنی معارف قرآنیہ کے مساس اور اصول کے لئے بھی طہارۃِ باطنیہ و تزکیہء قلب ضروری ہے۔

امام سیوطیؒ نے اتقان جلد نمبر ۲، صفحہ ۱۸۱ میں بدرالدین زرکشیؒ نے برہان سے نقل کیا ہے:

"اعلم انه لایحصل للناظر فهم معانیٰ القرآن ولا یظهر له اسراره وفیٰ قلبه بدعةاو کبر او هویٰ اوحب الدنیا وهو مصِر علیٰ ذنب"

پھر اس آیت کو صاحب اتقان نے دلیل میں لایا ہے:

"سأصرف عن آیاتي الذین یتکبرون في الارض بغیرالحق"

اس حوالہ سے تعلق مع اللہ اور تزکیہ کی مزید تائید ہو گئی۔

۲۔ سبب عادی اول معلم۔ یہ بھی ضروری ہو کہ معلم کو تزکیہ و تعلق مع اللہ اعتقاداًو عملاً حاصل ہو تاکہ حجاب ومانع فیضان علمی مرتفع ہو ثانیاً محقق فی العلوم ہو، کیونکہ معلم اور

استاد اگر ضعیف التحقیق ہو تو یہ مانع ہے۔ملاحظہ ہو حوالہ بالا جس میں ذکر ہے او ضعیف التحقیق۔

ا۔ معلم صرف فرائض کی ادائیگی نہ کرتا ہو بلکہ تعلیم اور شاگرد کو پورا محقق بنانا عبادت اور فریضہ الٰہی سمجھ کر کرتا ہو۔

۲۔ معلم کے قلب میں علم دین کی عظمت ہو، تاکہ متعلم کے ذہن میں اس کی صحبت واثر سے علم دین کی عظمت اس طرح راسخ ہو جائے کہ اس کی نظر میں علم کے مقابلے میں روئے زمین کی سلطنت ہیچ نظر آئے۔

۳۔ سبب عادی دوم۔ متعلم۔ متعلم کے لئے ضروری ہے کہ:

(۱)۔وہ علم دین کو عظیم ترین مقصد سمجھے اور دنیوی اغراض سے متعلق جملہ مقاصد کو علم دین کے مقابلے میں کوئی وقعت نہ دے۔

(۲)اس وراثت نبوت سے اس کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو اور یقین رکھے کہ: رضوان من اللہ اکبر۔اللہ کی رضامندی کل کائنات سے قیمت میں بڑھ کر ہے۔

(۳)۔ دل کو ہر اس خصلت اور عقیدہ سے اور اعتقاد کو ہر اس عمل سے پاک کرنے کی کوشش کرے، جن سے رضائے الٰہی میں خلل واقع ہوتا ہو۔

(۴)۔بڑے مقصد کے لئے چونکہ بڑی محنت کی ضرورت ہے اس لئے متعلم ہمہ تن مطالعہ کتب اور ورد و تکرار واضافہ معلومات میں مصروف ہو اور اس میں حکومت کرہ ارض کی تخت نشینی سے زیادہ مسرت اور اطمینان محسوس کرے۔

(۵)ادب کتب درسیہ اور احترام اساتذہ اور اجتناب معاصی کو اپنی عادت بنائے۔

۴۔ سبب عادی سوم۔ نصاب تعلیم۔ نصاب تعلیم ایسا ہو کہ دینی معارف جو غیر متبدل ہیں وہ مکمل ہوں لیکن ان کے عقلی اور عصری دلائل واسالیب تفہیم جو متبدل ہیں وہ عصر

حاضر کے اذہان کو متأثر کرنے میں مؤثر ہوں جن کی تفصیل جواب سوال دوم میں آئے گی۔

۵۔ سبب عادی چہارم۔ اسلوب وطرز تعلیم۔ مہمات عصریہ پر خصوصی توجہ دینااور مقالات لکھوانااور مکالمات کا سلسلہ جاری رکھنا۔

جواب سوال دوم۔ دینی درسگاہوں کو مردم خیز بنانے کے لئے اولاً توازن امور پنجگانہ کو بروئے کارلانے کی ضرورت ہے۔

ا۔ تعلق مع اللہ وتزکیہ باطنی کا انتظام۔ اسباب عادیہ میں معلم کی افادیت بڑھانے کی جو شرطیں ذکر ہوئیں اور متعلم کی تکمیل استفادیت و قابلیت کے لئے جو شرائط لکھی گئیں ان کو بروکار لایا جائے اور سبب سوم وچہارم یعنی نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم اس کے متعلق تجویز یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں تفسیر، حدیث، اصول الحدیث، فقہ، اصول فقہ کا مؤثر نصاب بدستور قائم رہے۔

اصول فقہ میں قیاس مصالح مرسلہ استحسان کے مباحث کو پوری تحقیق کے ساتھ پڑھایا جائے تاکہ شرائط قیاس کا صحیح علم ہو سکے اور مصالح مرسلہ کا اعتبار ان امور میں جن کے اثبات اور نفی پر ادلہ اربعہ میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہو اور اعتبار کرنے والا مجتہد ہو اور استحسان جس کا حاصل وہ حکم ہے جو کتاب وسنت اور اجماع یا قیاس خفی سے ثابت ہو اور اس کے استعمال کا حق بھی مجتہد کو ہے۔ بہر حال یہ مفصل بحث پوری تفصیل کے ساتھ آنا چاہیے، تاکہ ہر کوئی اجتہاد، قیاس، مالکیہ کے مصالح مرسلہ اور حنفیہ کے استحسان سے [1] دین سے فرار کے لئے چور دروازے پیدا نہ ہو سکے۔

---

[1] یعنی ان اصولی بنیادوں کا نام لے کر بے ضابطہ استعمال نہ کرے۔

۲۔ علوم جدیدہ میں سے معاون علوم دینیہ علوم داخل نصاب ہوں تاکہ علماء دین کو استدلال میں ان سے تقویت حاصل ہو اور بعض غیر ضروری یونانی علوم حذف کئے جائیں۔

۳۔ طرز تعلیم میں ایسا تصرف ضروری ہے جو عصری ضروریات کو پورا کرے۔مثلاً موضوعات ذیل پر محقق اساتذہ سے مقالات لکھوائیں۔

(الف)اشتراکی نظام کی دینی،سیاسی،عسکری،اخلاقی،معاشرتی،معاشی واقتصادی اورانسانی تباہیاں۔

(ب)سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی،عسکری،اخلاقی،معاشرتی،معاشی واقتصادی اورانسانی تباہ کاریاں۔

(ج)اسلام کے فطری معاشی نظام کے مذکورہ امور کے متعلق فوائد۔

(د)سیاسی،معاشی،اخلاقی،معاشرتی اور عسکری فوائد۔

(ھ)ختم نبوت بقاءملت کی روح ہے۔

(د)مقامِ حدیث۔

(ز)مقامِ صحابہ کرامؓ۔

(ح)حیاتِ انسانی کے لئے دین کی ضرورت۔

(ط)اسلام دینِ فطرت ہے۔

(ی)اسلام عالمگیر مذہب ہے۔

(ک)قرآن اورامنِ عالم۔

(ل)رحمت العالمین ﷺ اورامنِ عالم۔

(م)شریعتِ اسلام برتری تمام قوانینِ عالم پر۔

(ن) قرآن کی محفوظیت۔

(س) قرآن کا اعجاز۔

(ع) مجازاۃ اعمال کا فلسفہ۔

(ف) عقیدہ تقدیر کی حقیقت اور اعمال انسانی پر اس کا عمل واثر اور ترقی دینی ودنیوی میں اس کے موثر محرکات وعوام کا بیان۔

جواب سوال سوم۔ علوم دینیہ کا مقصد رضا الٰہی کا حصول ہے اور مقصد حیاۃ بشریہ کا تعین ہے یعنی عبادت واطاعت الٰہی جو مظہر رضائے الٰہی ہے اور نص قرآن "وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون" میں اس کی تصریح موجود ہے اور یہی مقصد انسانی اور حیوانی زندگی کے درمیان حد فاصل ہے اور شرف انسانیت کا مظہر اتم ہے۔ یہی مقصد یعنی طاقت الٰہی وعبادت خداوندی مرضیات ونامرضیات کی معرفت اور عمل کا نام ہے اور بعثت رسل وانزال کتب الہیہ اور تعلیم علوم دینیہ سب اسی مقصد کے لیے ہیں بلکہ عالمی امن واطمینان وحفظ حقوق بشری واصلاح انسانی بھی اسی مقصد کے بغیر ناممکن ہے خواہ دیگر ہزاروں علوم پڑھائے جائیں اور لاکھوں کتابیں تصنیف کی جائیں اور سینکڑوں ذرائع نشر اشاعت کو کام میں لایا جائے تب بھی نتیک سوء، بربادی اور بے باہی کے کچھ نہ ہوگا ۔ دور حاضر کی عالمگیر تعلیمات نے انسانی بے چینی کو ختم نہیں کیا، بلکہ اس میں ہزار گنا اضافہ کیا اور تکمیل حرص وخواہشات نفس کے لئے ایسے مہلک اوزار واسلحہ مہیا کئے کہ انسان کی زندگی کو زمین پر ناممکن بنا دیا۔ ایٹمی اسلحہ کے زور سے بچنے کے لیے اس نے انسانی آبادی کے اکثر حصے کو زیر زمین سرنگوں اور غاروں میں دھکیل دیا۔

اصل جملہ علمہا این است واین　　　تابدانی من کیم در یوم دین

اس مقصد کے استحضار کے لیے۔

۱۔ کتاب وسنت کے نصوص متعلقہ بالآخرۃ کا استحضار وتذکر۔

۲۔ صحابہ کرامؓ اولیاء کرامؒ کے احوال کا مطالعہ۔

۳۔ اہل اللہ کی صحبت۔

۴۔ احیاء العلوم کے منتخب ابواب اور حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کرنا، پڑھنا اور سننا۔"[1]

ناکارہ کا خیال

جن کمزوریوں اور ناکامیوں کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ مدارس کے جو مقاصد پہلے درج کئے گئے ہیں، ان کے حاصل کرنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک تعلیم کے باب میں خوب محنت ومشقت سے کام لینا اور دوسری چیز تربیت اور صلاح واصلاح کے میدان میں مجاہدہ کرتے رہنا۔ اور بحالت موجودہ ان دونوں ابواب میں کماحقہ محنت نہیں ہو رہی۔ یعنی جس طرح محنت کرنے کا حق ہے اور پہلے اس کا تسلسل بھی تھا، اس طرح محنت اب مفقود ہوتی چلی جارہی ہے۔ اگر اس بات کی کھوج لگائی جائے کہ کماحقہ محنت کیوں نہیں ہو رہی؟ تو واضح ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ اقدام یا انجام کرتا ہے، وہ در اصل اندرونی جذبات وعادات سے مجبور ہو کر کرتا ہے چنانچہ پہلے انسان کے دل میں ارادہ انگڑائیاں لینا شروع کرتا ہے اور جب وہ مکمل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد انسان کوئی قدم اٹھاتا ہے اور ظاہری اعضاء وجوارح اس کے تابع فرمان بن کر ارادے کو عملی جامہ پہنانے لگ جاتے ہیں۔ اور بحالت موجودہ یہ جذبات محرکات ماند پڑ چکے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، جولائی ۱۹۸۱ء

کمزوری کی اصل جڑ

اگر کوئی اس سے آگے بڑھ کر اس بات کی بنیاد معلوم کرنا چاہے کہ اندرونی جذبات وکیفیات میں روز افزوں انحطاط کیوں ہو رہا ہے اور پہلے کی طرح اب یہ جذبات ہمارے اوپر اس قدر حاوی کیوں نہیں ہو جاتے کہ ہم اپنے دکھ درد، اپنی صلاحیتیں اور استعدادیں اس دین حق کی خدمت، سربلندی اور مدرسہ کا کامیابی وترقی کی راہ پر نچھاور کردیں اور کیوں نہ ہم اپنے اکابر واسلاف کی طرح ہر چیز کی قربانی دیکر اس کام کو سب کاموں پر ترجیح دینے لگ جائیں اور اپنے خون پسینوں سے مدارس کے در دیوار اوراس کی روح ومقاصد کی سینچائی کو اپنا سرمایہ افتخار اور مقصود حیات تصور کریں!

تو ایسے تحقیق پسند مزاج شخص کو یہی جواب دیا جائے گا کہ جذبہ اور محرک سے بھی پہلے ایک چیز پیدا ہوتی ہے جس پر جذبات ومحرکات کی عمارت استوار ہوتی ہے، وہ ہے علم وشعور۔ چنانچہ کسی چیز کی معرفت حاصل ہو جائے، اس کی اہمیت وافادیت دل میں جاگزیں ہو جائے تو اس کے بعد ہی اس کی طرف ارادہ کا سرا اٹھتا ہے اور تبھی آدمی چاہنے لگتا ہے کہ اس کام کو کسی طرح کر گزرے۔ پھر جس قدر اہمیت کا گمان واحساس ہوتا ہے، اسی قدر جذبہ میں جوانی وتوانائی دکھائی دیتی ہے، زیادہ اہمیت وافادیت کا یقین ہو تو جذبات میں بھی حد رجہ ہیجان وطوفان کی سی فضاء جنم لیتی ہے اور اہمیت کا گمان کم ہو تو جذبات میں اس قدر سردی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ اور کمزوری کا بنیادی سبب یہی ہے کہ جن عظیم اور گراں قدر مقاصد کے لئے مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ ابھی تک نظروں سے اوجھل اور علمی افق سے بلند تر ہے یا اگر وہ مقاصد معلوم ہوں تو اس کی جس طرح اہمیت دل میں موجود ہونی چاہئے تھی، وہ اہمیت دل میں اتری نہیں ہے۔ یہی اہمیت ہی

انسان کو اخلاص اور جد وجہد کے ساتھ کام کرنے اور کرتے رہنے پر اکسایا کرتی ہے، اب جب یہ بنیاد مستحکم نہیں ہوئی تو اس پر اخلاص کا محل کھڑا رہ سکتا ہے اور نہ جد وجہد کی عمارت راسخ ہو سکتی ہے۔ ان مقاصد کی کما حقہ اہمیت جب دل میں جگہ پانے لگ جائے تو پھر اس کی اولین ترجیح یہی ہوتی ہے وہ اسی کو زندگی کا اہم ترین مقصد وہدف ٹھہرانے لگتا ہے اور اسی میں اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل ہونے کا یقین کرتا ہے اور یہی وہ سرمایہ اور آب حیات ہے جو مدارس وغیرہ تحریکات کی کامیابی کا راز واساس ثابت ہو جاتا ہے۔[1]

یہی اصل مرض معلوم ہوتا ہے، پھر اس کے مختلف مظاہر ونتائج ہیں جن کو بسا اوقات کمزوری کا جڑ اور مرض کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کمزوریوں کی اصل واساس نہیں بلکہ اس کے برگ وبار ہیں۔ مثال کے طور پر:

الف: مدارس کے مختلف ذمہ داران (ارباب اہتمام، انتظام یا مدرسین) کا مدرسہ اوراس کے مختلف امور کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کرنا۔

ب: اہلیت نہ رکھنے والے افراد کو مختلف مناصب سپرد کرنا۔

ج: عام لوگوں کا مدرسہ کے کام میں دلچسپی نہ لینا۔ تعلیم کے لئے بچوں کو نہ بھیجنا، مالی تعاون نہ کرنا۔

د: طلبہ کا شوق ورغبت نہ رکھنا اور محنت وسلیقہ مندی کے ساتھ پڑھائی کے کام کی طرف متوجہ نہ ہونا۔

---

[1] حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ اپنے ایک مسترشد کو خط لکھتے ہیں:
"روح ترقی مدرسہ، اخلاص وابتغاء مرضات اللہ پر ہے، جب تک یہ سرمایہ رہے گا، ترقی ہوگی"۔ (مکتوبات افغانی، مکتوب ۶۲ ص ۱۲۹)

ر: چندے میں احتیاط نہ کرنا، اور حرام وحلال کی تمیز کے بغیر چندہ جمع کرنے کی کوشش کرنا اور طلبہ کرام کو مشتبہ مال سے کھلانا۔

س: طلبہ کی تعلیم وتربیت پر اچھی طرح توجہ نہ دینا۔

ش: نصاب تعلیم کے حوالہ سے اٹھنے والے مختلف اشکالات وشبہات۔

حسی نظیر

اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص کے بدن میں درد ہے، ہڈیوں میں تکلیف محسوس ہوتی ہے، بدن میں جان ونشاط نہیں ہے، سر میں درد ہے اور منہ کا ذائقہ خراب ہے۔ یہ سب کچھ باتیں اگرچہ تکلیف دہ ضرور ہیں لیکن اصل مرض نہیں ہے بلکہ بخار کی مختلف علامات ہیں اور پھر بخار بھی اصل بنیاد نہیں ہے بلکہ اسباب کی جہاں میں اس کے مختلف اسباب ہیں مثال کے طور پر بہت زیادہ تھکاوٹ اور زکام وغیرہ۔ اب اگر سینے کی خرابی اور سخت قسم کے زکام کی وجہ سے بخار چڑھتا ہے اور ہڈیوں وغیرہ چیزیں اسی کے اثرات ونتائج ہیں، اب بجائے اس کے کہ آدمی ایسی حالت میں ہڈیوں یا سر کے درد کا علاج وتدبیر کرے۔ بہتر اور مقدم یہی ہے کہ اصل مرض معلوم کرکے اس کا علاج وانتظام کرے، کیونکہ یہ سب چیزیں اسی کے نتائج ومظاہر ہیں، اگر اس کا علاج کامیاب ہوجاتا ہے تو یہ سب چیزیں اصلاً اپنا وجود نہیں رکھتی، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فناء ہوجائیں گی۔"والمثلُ مشهور معقول أنّه إذا زال السّبب زال المسبّب".

کیا مخالفت اور سازش ناکامی کا ذریعہ ہے؟

بسا اوقات مختلف افراد / طبقات یا حکومت وریاست کی مخالفت، ان کی منصوبہ بندیوں اور ناہموار فضاء کو ساری کوتاہیوں کا قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے لیکن مدرسہ سے

تعلق رکھنے والے حضرات (اور وہی اس کتاب کے اصل مخاطب ہیں) پر یہ بات کسی طرح مخفی نہ رہنی چاہیے کہ:

۱۔ مخالفت کا ہونا اور ناہموار کا سامنا کرنا یہ ایسی چیز ہے جس کے ساتھ حق بات اور حق کام کا تقریباً ہر دور اور ہر میدان میں سامنا ہوتا رہا ہے، اس سے کبھی حق میں اضمحلال و تنزل پیدا نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حق کے ساتھ ایسی فضاء گاہے بگاہے ضروری اور بڑی حد تک مفید ہے۔

۲۔ خلوص، تدین و تقویٰ اور استقامت کے ساتھ حق کام کرتے رہنا، ایک ایسا آہنی حصار ہے جہاں اگر کوئی شخص یا ادارہ پناہ لینا چاہئے تو ہر مخالف منصوبہ بندی اور دشمنانہ سازش سے اس کی اچھی طرح حفاظت ہو سکتی ہے۔

یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو نصوص سے ثابت ہیں اور ہزاروں لوگوں کے آزمودہ تجربات بھی ہیں اور فکری و فلسفی لحاظ سے معقول و مؤثر بھی۔ اہل مدارس کے سامنے اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم تسلی خاطر کے لئے دو تین آیتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

یہود و منافق جس قدر دین اسلام اور مسلمانوں سے حسد و نفرت کرتے تھے، اسلام کے عروج و ترقی سے ان کو جس حد تک تکلیف و اذیت پہنچتی تھی، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، پھر یہودیوں کی شاطرانہ طبیعت اور مکر و فریب کی خمیر سے لت پت مزاج مذاق اس پر مستزاد۔ قرآن کریم نے اس سیاق و سباق میں یہ ارشاد فرمایا:

{ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ } [۱]

ترجمہ: اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری کرو تو ان کے فریب سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا بیشک اللہ ان کے اعمال پر احاطہ کرنے والا ہے۔

"سورۃ انعام" میں ارشادِ خداوندی ہے:

{وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ } [۲]

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شریر آدمیوں اور جنوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے کو ملمع کر ہوئی باتیں فریب دینے کے لیے سکھاتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو یہ کام نہ کرتے سو تو انہیں اور جو جھوٹ بناتے ہیں اسے چھوڑ دے۔

"سورۃ فرقان" میں ہے:

{ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا} [۳]

ترجمہ: اور ہم اسی مجرموں کو ہر ایک نبی کا دشمن بناتے رہے ہیں اور ہدایت کرنے اور مدد کرنے کے لیے تیرا رب کافی ہے۔

---

[۱] سورة آل عمران،ص: ۱۲۰

[۲] سورةالأنعام،ص: ۱۱۲

۳ سورة الفرقان ،ص : ۳۱

احتیاط کے باوجود کوتاہی ہو تو

یہاں تک جن کمزوریوں کا ذکر کیا گیا ہے، اگر ان سے اچھی طرح بچا جائے اور اس پر قابو پانے کے لئے جن تجاویز کی نشاندہی کی گئی ہے، اگر ان کی پوری پابندی کی جائے اور اس کے بعد بھی مدارس کے اثرات ونتائج میں کمی واقع ہو، تو اس پر پریشان ہونا تو ایمانی درد کی علامت ہے جو محمود و قابل تعریف بھی ہے اور اختیاری کمزوریوں کے در آنے سے حفاظت کا ڈھال بھی، اس لئے یہ کیفیت تو ہونی چاہئے، لیکن بہر حال اس کی وجہ سے زیادہ مایوسی اور بے قراری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ایک غیر اختیاری امر یا تکوینی فیصلہ سمجھ کر پوری ہمت و استقامت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہنا چاہئے۔

اللہ کے مخصوص بندوں کی صفات وعادات

قرآن کریم نے ایک جگہ اللہ والوں کی کچھ صفات وعادات بیان فرمائی ہے، ایسے موقع پر ان صفات کی باربار یاد دہانی ہونی چاہئے اور جہاں تک ہو سکے ان کو اپنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے:

{وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (١٤٦) وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (١٤٧) فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ}[1] []

---

[1] سورة آل عمران،ص: ١٤٦ – ١٤٨

ترجمہ: اور کئی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت اللہ والے لڑے ہیں پھر اللہ کی راہ میں تکلیف پہنچنے پر نہ ہارے ہیں اور نہ سست ہوئے اور نہ وہ دبے ہیں اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور انہوں نے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہ بخش دے اور جو ہمارے کام میں ہم سے زیادتی ہوئی ہے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کی قوم پر ہمیں مدد دے۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا عمدہ بدلہ دیا اور اللہ نیک کاموں کو پسند کرتا ہے۔

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ خدمت دین کے راستہ میں کبھی ظاہری ناکامی کا سامنا ہو جائے تو ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ:

الف: ان مصائب ومشکلات اور مخالف فضاء وماحول کی وجہ سے ان کے جذبات و نظریات میں کوئی کمی نہیں آتی۔

ب: ان کے کردار و عمل میں بھی کوئی کوتاہی نہیں آتی۔ بلکہ جذبہ اور عمل دونوں سطح پر وہ استقامت کی تصویر بن کر جمے رہتے ہیں۔

ج: اپنی کمزوریوں پر ان کی نظر ہوتی ہے، اپنے عیوب وخامیوں سے وہ غافل نہیں رہتے اور ظاہری ناکامی ومصیبت کو بھی اپنے ہی اعمالِ بد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن ہی کا تعلق قائم رکھتے ہیں۔

د: ظاہری ناکامی کے بعد بھی وہ پُر عزم، باہمت اور حوصلہ مند رہتے ہیں اور اپنی ہی قوت پر گھمنڈ نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی دعائیں کرتے ہیں۔

اگر اہلِ مدارس تمام تر احتیاط کرنا شروع کریں اور اس کے باوجود بھی ان کے نیک مقاصد اور بلند اہداف حاصل نہ ہوں تو ایسے موقع پر مناسب یہ ہے کہ احساس

کمتری، کم ہمتی یا حوصلہ پستی کے شکار نہ ہوں بلکہ درج بالا صفات وعادات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتے رہا کریں۔

ضمیمہ

کھانا جمع کرنے کے لئے طلبہ کو گھر گھر بھیجنا اور مسلمانوں کی ذمہ داری[1]

اس دور میں امتِ مسلمہ مصائب ومشکلات کی جس تپتی ہوئی پٹڑی پر سے گزر رہی ہے، اس کے بنیادی اسباب وعوامل میں سے ایک اہم، بنیادی اور گھمبیر مسئلہ علمِ دین کے اصل مفہوم اور اس کے ضروری حدود ومعیار کا بدل جانا، اہل علم کی ناقدری اور ان سے دوری ونفرت ہے، اہل علم سے قلبی محبت، ان کی مجالست ومصاحبت وہ حصن حصین ہے جو اس امت کے لئے علمی وعملی اور اعتقادی گمراہیوں سے بچنے کا کامیاب ذریعہ رہا ہے، ان قدسی صفات سے دوری کی وجہ سے امت کے دل ودماغ کے دریچے ہر قسم کی گمراہیوں کے لئے کھولنے کے مترادف ہے اس لئے ہر باطل کا اولین اقدام یہی ہوتا ہے کہ افرادِ امت کو علماء سے دور کیا جائے۔

علم اور اہل علم کی ناقدری کا ایک نتیجہ وہ بھی ہے جو ہمارے ہاں پاک وہند کے بہت سے دیہاتوں میں رائج ہے جس کو بعض جگہوں میں "وظیفہ جمع کرنے" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، ہوتا یوں ہے کہ دور دراز سے غریب اور مالی استعداد کے اعتبار سے کمزور طلبہ حصولِ علم کے لئے سفر کرتے ہیں، وہاں باقاعدہ مدرسہ کا نظام نہ ہونے یا مدرسہ کی طرف سے خورد ونوش کی سہولت میسر نہ ہونے کے باعث کسی کم عمر بچے کو مقرر کرتے ہیں اور وہ کھانے کے وقت آس پاس کے مختلف گھروں کے پاس جاکر روٹی

---

[1] یہ مضمون سہ ماہی الصدیق صوابی کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ / اکتوبر ۲۰۱۷ میں شائع ہوچکا ہے، نیز یہ ان مضامین کے مجموعہ میں بھی شامل ہے جو تقریبا دوسو کے قریب علمی وفقہی مقالات کا مجموعہ ہے، جس پر نظر ثانی، تحقیق جاری ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوگی۔

اور سالن مانگتا اور جمع کرتا ہے یہی ان کے گزرانِ اوقات اور حصولِ علم کے زمانے کا ذریعہ معاش ہوتا ہے، یہ طریقہ کار برصغیر کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور یہاں اسی پر چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریق کار اپنی ایک لمبی تاریخ رکھتا ہے، اس امت کے بڑے قابل قدر اور محسن شخصیات اس دور سے گزرے ہوں گے، لیکن موجودہ دور میں، جبکہ اہلِ علم اور عوام کے درمیان فاصلوں اور بدگمانیوں کی ایک نہ ختم ہونے والی وسیع وعریض خلیج موجود ہے، اس پر نظرِ ثانی اور اس کی واقعی شرعی حیثیت کی تعیین وتحدید کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بحالت موجودہ اس میں کئی ایسے عناصر شامل ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کی اجازت دینا یا حوصلہ افزائی کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے جس کی کچھ تفصیل پیش خدمت ہے:

۱: سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے علم دین اور اہل علم کے توہین ومذاق کا دروزاہ کھل جاتا ہے، گلی کوچوں میں پھرنے والے اوباش نوجوانوں اور تہذیبِ جدید کے فریب سے مرعوب دل ودماغ کی وجہ سے معاشرہ میں اس کی بہت کچھ توہین واستہزا کی جاتی ہے، بعض گھرانوں کی طرف سے ان معصوم طلبہ کے ساتھ انداز وخطاب کا جو کچھ سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ انسانی شرافت کے لئے ناقابل برداشت ہے، بہت سے کم نصیب لوگ اس کو علم اور دیندار طبقہ کی طرف سے ایک بالکل غیر واقعی تصویر کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ چیز بہت سے والدین کے لئے اپنے بچوں کو دینی علوم کے زیور سے آراستہ کرنے کی نعمت سے محرومی کا سامان بن جاتی ہے۔

۲: بچوں کا اس طرح گھر جاجا کر کھانا جمع کرنا "سوال" ہے جس کی احادیثِ مبارکہ میں کافی مذمت کی گئی ہے اور اس پر بہت سے وعیدیں وارد ہوئی ہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ

نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جس نے لوگوں سے بھیک مانگا جب کہ اس کے پاس بقدر کفایت کچھ تھا، تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر خراشیں ہوں گیں"[1]

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الانافۃ فیما جاء فی الصدقۃ و الضیافۃ" میں سوال کی مذمت و ممانعت کے سلسلہ میں ایک دو نہیں بلکہ تیس (۳۰) تک روایات جمع فرمائی ہے، ان جیسی روایات کی روشنی میں فقہائے حنفیہ نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جب کسی کے پاس ایک دن تک پیٹ بھرنے کے لئے اور ستر چھپانے کے لئے کچھ ہو یا عملی طور پر تو اتنا سامان موجود نہ ہو البتہ اس کے کمانے پر قادر ہو تو ایسے شخص کے لئے لوگوں سے مانگنا جائز نہیں، اس کے باوجود مانگے گا تو گناہ گار ہو گا۔[2]

واضح رہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک اکثر علاقوں میں اس رسم کا جو رواج تھا جن کو اہل علم نے دیکھنے سننے کے باوجود منع نہیں فرمایا، وہاں یہ چیز سوال ممنوع میں داخل نہیں تھی، کیونکہ اس میں لوگوں سے اقدام کرکے کھانا نہیں مانگا جاتا تھا بلکہ کئی لوگ از خود ہی درخواست و سفارش کرتے کہ ہمارے گھر سے بھی کھانے جمع کرنے والا آجائے اور اس کو وہ اپنے لئے تبرّک و سعادت مندی کا ذریعہ تصور کرتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کرنا اس وقت بھی کوئی کلی ضابطہ نہ تھا اور اب تو صورت حال اس سے زیادہ ابتر ہے، پہلے زمانے میں عموماً لوگوں کی طرف سے سفارشات و مطالبے ہوتے تھے اور کچھ استثنائی صورت سوال مذموم کی حد تک پہنچ جایا کرتی تھی جبکہ اب معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔

---

[1] سنن الترمذی، رقم الحدیث: ٤٥٠.

[2] تحفة الفقهاء، ج١ص٣٠٢.

۳: جب سوال کرنا ہی ممنوع ہے تو اس کے نتیجہ میں حاصل کردہ کھانے میں بھی کچھ نہ کچھ خبث آئے گا، اس لئے فقہاء کرام نے بھیک پر حاصل کی ہوئی کمائی کو خبیث قرار دیا(فتاویٰ ہندیہ[1]) لہٰذا ایک تو خبیث چیز کا خود استعمال کرنا شرعاً درست نہیں اور دوسری طرف اس کھانے کے نتیجہ میں اصل مقصود یعنی نورِ علم کا حاصل کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ خورد ونوش کا انسانی مزاج کے تعمیر و تشکیل، دل میں پیدا ہونے والے جذبات وافکار، اور اس کے ذریعے ظاہر ہونے والے اخلاق واوصاف میں بڑا کردار ہے، حلال وپاک رزق کے تناول کرنے سے پاکیزہ احوال واخلاق جنم لیتے ہیں جبکہ حرام وخبیث اشیاء کھانے سے اسی کے مطابق اثرات نمودار ہوتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ سورۃ انبیاء میں حضرات انبیاء کرام ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے عمل صالح اختیار کرنے سے پہلے ہی پاکیزہ کھانے کا حکم دیا گیا۔

۴: تجربہ بتارہا ہے کہ اس عمل کے عادی ہو جانے کی وجہ سے طلبہ میں نفسیاتی، اخلاقی پستی اور ایک قسم کی بے اعتمادی سی پیدا ہو جاتی ہے جو رفتہ رفتہ کئی نقصانات کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ایک باصلاحیت اور ذی استعداد انسان بھی معاشرے کی تعمیر وترقی اور اس کی دینی خدمت واصلاح سے محروم رہ جاتا ہے۔

۵: اس میں طلبہ کرام کا جو کچھ وقت ضائع ہو جاتا ہے اور جو کچھ تربیت میں کمی ہو جاتی ہے وہ بھی کسی ہوشیار آدمی سے مخفی نہیں ہے۔

٦: گھر جا جا کر دروازہ کھٹکھٹانا خطاب خاص کے قبیل سے ہے جو بسا اوقات بعض شریف لوگوں کے لئے اس بات کا بھی سبب بن جاتا ہے کہ وہ دلی رضامندی کے بغیر محض شرما

---

[1] الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، ج٥ص٣٤٩).

شرمی یا بدنامی وغیرہ کے ڈر سے کچھ دیدیں اور ظاہر ہے کہ اس طور پر دی ہوئی چیز حلال نہیں ہوتی، اس لئے یہ طریقہ کار بھی درست نہیں۔

۷: اس کام کے لئے عام طور پر نابالغ بچوں کو ہی استعمال کیا جاتا ہے اور انہی کے ذریعے یہ کام انجام پاتا ہے، جبکہ نابالغ افراد کی خدمات لینے میں بھی شرعاً احتیاط کی ضرورت ہے، جس طرح وہ مالی تبرعات کی اہلیت نہیں رکھتے، یوں ہی وہ خدمات کی تبرع کرنے کے بھی اہل نہیں ہوتے، حضرات فقہاء کرام نے تو بعض جزئیات میں یہاں تک بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص نابالغ بچے کی خدمت اپنے لئے کام میں لائے تو اس پر ضمان لازم ہے۔

"مجلہ" میں ہے:

لو استخدم أحد صغيرا بدون إذن وليه فإذا بلغ يأخذ أجر مثل خدمته ولو توفي الصغير فلورثته أن يأخذوا أجر مثل تلك المدة من ذلك الرجل.[1]

لمحہ فکریہ

ان تمام گزارشات کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کرنا مناسب ہے کہ جس مقصد کی تحصیل کے لئے ان تمام باتوں کو گوارا کر لیا جاتا ہے خود اس مقصد کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا مروجہ تمام علوم وفنون کا سیکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ہر مسلمان یا ہر طالب علم پر فرض ہے؟ اگر فرض عین ہی ہے تو کیا اس فرض کی تکمیل کے لئے صرف یہی ایک راستہ باقی ہے یا اور بھی کوئی مناسب صورت ممکن ہے؟

---

[1] مجلة الأحكام العدلية، المادة ٥٩٩، ص: ١١٢.

اس کا جواب واضح ہے کہ ان تمام علوم کی تحصیل فرض عین کے درجہ میں ہے نہ ہی اس کے حصول کا یہ کوئی واحد راستہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن علوم وفنون کو حاصل کرنے کے لئے اس کا انتظام ہوتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کے درجہ میں ہے اور اس میں کفائی مقدار کو پورا کرنے والے افراد کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، بلکہ مدارس کی روز افزوں ترقی اور اہل علم کی مخلصانہ مساعی کے بل بوتے الحمدللہ یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔

اور اگر بالفرض ایسا نہ بھی ہو تو بھی فرض کفایہ کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لئے یہ کوئی واحد سبیل نجات نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی راستے کھلے پڑے ہیں جس میں سب سے احسن اور مناسب صورت یہ ہے کہ باقاعدہ کسی دینی مستند ادارے میں داخلہ لیا جائے جہاں تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ قیام وطعام کا بھی انتظام ہو اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان ہی میں نہیں بلکہ برصغیر پاک وہند کے طول وعرض میں ایسے اداروں کی کمی نہیں ہے جہاں ہر کوئی جا کر اپنی دینی پیاس اچھی طرح بجھا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ اگر کسی جگہ لوگ طیبِ خاطر سے کھانا وغیرہ دیتے ہوں اور وہاں طالب علم کا لوگوں کے گھر جا کر مانگنے کو ذلت نہ سمجھا جاتا ہو تو وہاں اس طرح کرنا جائز ہے اور کچھ عرصہ تک یہی صورت حال اکثر جگہ موجود تھی، لیکن ظاہر ہے کہ اب وہ حالات باقی نہ رہیں اس لئے اگر کہیں ایسا ماحول موجود بھی ہو تو اس وقت بھی مناسب یہی ہے کہ اہلِ محلہ میں سے کچھ لوگ خود یہ ذمہ داری اٹھائیں اور خود کھانا لایا کریں، اگر کسی وجہ سے خود آمد ورفت ممکن نہ ہو تو محلہ ہی میں سے کسی کو اس کام کے لئے مقرر کیا جائے جو خواہش مند ورضامند حضرات کے گھروں سے کھانا لایا کریں، اس معمولی سی تکلیف پر

ایک طرف اگر صدقہ وضیافت کا ثواب حاصل ہو گا تو دوسری جانب مسافر طلبہ اور علم دین کی خدمت کی ابدی سعادتیں بھی انشاء اللہ حاصل ہوں گی۔

آج سے کافی عرصہ پہلے ہندوستان کے نامور عالم دین اور بزرگ شخصیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے اس بات کا احساس کیا اور لوگوں کو اس پر متنبہ بھی فرمایا تھا، آپ ایک مکتوب میں مدارس کے اندر رائج نقصانات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

"اکثر جگہ جہاں طلبہ کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں، طلبہ کے لئے معیوب ہے کہ کسی کے گھر پر کھانا لینے جائیں کہ اس میں سخت تحقیر و اہانت ہے علم اور اہل علم کی، نیز اس میں ایک اخلاقی خرابی ہے کہ دوسرے سے مانگنے میں انقباضِ طبعی یعنی جھجک نہیں رہتی، دل کھل جاتا ہے اور یہی انقباض طبعی حیاء کی ایک بڑی فرد ہے جو مانع ہے انسان کو سوالِ مذلت سے، جب یہ نہ رہی تو اب اس کا سوال سے رکنا عقلاً ہو گا طبعاً نہ ہو گا اور غرض ایسی چیز ہے جو مانع عقلی کو جلد رفع کر دیتی ہے ایسے وقت مانع طبعی ہی کی ضرورت ہوتی ہے، جب وہ نہ رہی تو اس شخص کو جب موقع ملے گا بے تکلف لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دے گا تو گویا عمر بھر کے لئے ایک کمال فطری برابر ہو گیا، پھر جب اس شخص کی قدر و منزلت کسی کے دل میں نہ رہی تو اس کا وعظ وارشاد کیا نافع و مؤثر ہو گا؟

اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اس طریقہ کا بند کیا جائے، جو شخص طالب علم کو کھانا دینا چاہے وہ مدرسہ میں بھیج دے۔"[۱]

---

[۱] حقوق العلم، ص۷۷. مکتبۃ البشری.

مخیر حضرات کی ذمہ داری

یہاں تک کے گزارشات کا تعلق تو اہل علم اور طلبہ کرام سے تھا، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عام مسلمان لوگ بھی علم دین اور اس کے عظیم تر حاملین کے ساتھ امداد وتعاون کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو تہی دامن سمجھیں، بلکہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان عالی قدر حضرات کی خوب قدر وعزت کریں اور جائز امور میں اپنی استطاعت کے مطابق ان حضرات کے ساتھ اچھی طرح امداد وتعاون کا ثبوت دیں، ایسا کرنا اگر ایک طرف شرعی اور تقاضا ہے تو ساتھ ساتھ عقلی اور اخلاقی پہلو کا بھی یہی منشا ہے۔

شرعی تقاضا ہونے کی وجہ توظاہر ہے کہ اجتماعی سطح پر دینی امور کی خدمت امتِ مسلمہ کا اجتماعی فریضہ ہے جو اکثر وبیشتر اہلِ علم ہی کے ہاتھوں پورا ہو رہا ہے تاریخ شاہد ہے کہ پچھلے ادوار میں اسلامی حکومت کی جو کچھ فرائض اور ذمہ داریاں تھیں، کسی صحیح اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ساری ذمہ داریاں انہی خوش نصیب افراد کے کندھوں پڑی ہوئی ہیں لہٰذا ان کی خدمت ومدارات بھی امت کی ذمہ داری بلکہ خوش نصیبی ہے، عقل واخلاق کا بھی یہی صدا ہے کہ جو کوئی دوسرے کے کام میں مصروف رہتا ہے تو اس کا نان ونفقہ اور اس کے ضروری اخراجات بھی اسی پر عائد ہوتے ہیں اور اس وقت اس کے اخراجات وضروریات سے آنکھیں چرانا، اپنے آپ کو اس سے غافل کرنا انسانی شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ ان بوریہ نشینوں کی خدمت صرف اپنی دینی واخلاقی ذمہ داری ہی نہ سمجھے بلکہ اس کو اپنے لئے سعادت مندی کا سنہرا موقع اور غنیمت جانیں ورنہ سنت اللہ یہ ہے کہ نعمت کی ناشکری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا پکڑ بڑا سخت ہوتا

ہے، خدانخواستہ اگر علم اور اہل علم کی عظیم نعمت سے ہمارا معاشرہ بھی محروم رہاتو اس کا جو کچھ مستقبل ہو گا ایک شریف اور غیور انسان کے لئے اس کا تصور کرنا بھی نہایت دردناک اور المناک ہے۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو ان حضرات کی صحیح قدر دانی اور ان حضرات کی بھر پور وبے لوث خدمت اور تعاون کی توفیق نصیب فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مصادر ومراجع

أخبار القضاة، للعلامة أَبُو بَكْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ خَلَفِ بْنِ حَيَّانَ بْنِ صَدَقَةَ الضَّبِّيّ البَغْدَادِيّ، المُلَقَّب بِـ"وَكِيع" ت عبد العزيز مصطفى المراغي الناشر: المكتبة التجارية الكبرى،

الإسعاف في أحكام الأوقاف المؤلف: إبراهيم بن موسى بن أبي بكر ابن الشيخ علي الطرابلسي، الحنفي (المتوفى: ٩٢٢هـ) الناشر: طبع بمطبعة هندية

الأشباه والنظائر، للعلامة زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (المتوفى: ٩٧٠هـ) وضع حواشيه وخرج أحاديثه: الشيخ زكريا عميرات

امداد الاحکام، حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی

البحر الرائق، للعلامة زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (المتوفى: وفي آخره: تكملة البحر الرائق لمحمد بن حسين بن علي الطوري الحنفي هـ) وبالحاشية: منحة الخالق لابن عابدين، الناشر: دار الكتاب الإسلامي،

البناية شرح الهداية، للعلامة أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى دار الكتب العلمية - بيروت، لبنانالطبعة: الأولى، ١٤٢٠هـ - ٢٠٠٠م

پرانے چراغ، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب رحمہ اللہ، نشریات اسلام کراچی

تحفۃ العلماء، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ و مرتبہ مولانا مفتی محمد زید صاحب، الناشر البرکۃ کراچی پاکستان

الترغیب والترھیب للمنذري، للامام الحافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری رحمۃ اللہ علیہ، المتوفی ٦٥٦ھ، الطبعۃ دار ابن حزم

التمهيد ، للعلامة أبو عمر بن عبد البر بن عاصم النمري القرطبي وزارة عموم الأوقاف والشؤون الإسلامية-

التيسير بشرح الجامع الصغير،زين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف المناوي القاهري (المتوفى:١٠٣١ھ-)الناشر:مكتبة الإمام الشافعي-الرياض۔

جامع الفصولين، للعلامة بدرالدين محمود بن اسرائیل الشهير بابن قاضی سماونه الحنفی المتوفی ۸۲۳ھ ،الطبعة:اسلامی کتب خانہ

جامع بيان العلم وفضله،للعلامة أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمري القرطبي (المتوفى:٤٦٣ھ ، تحقيق: أبي الأشبال الزهير الناشر: دار ابن الجوزي۔

خیر الفتاوی،لاستاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ ومرتبہ مولانا مفتی محمد انور زید مجدھم،الناشر مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان

خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت۔حضرت مولانا قاضی محمد اطہر مبارک پوری صاحب رحمہ اللہ

الدر المختار وحاشية ابن عابدين، للعلامة ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي(المتوفى:١٢٥٢ھ-الناشر: دار الفكر-بيروت

درر الحكام شرح غرر الأحكام، محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (المتوفى:٨٨٥ھ-)الناشر: دار إحياء الكتب العربية

سنن الترمذي ت شاكرم،للعلامة حمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي- مصر

السنن الكبرى للبيهقي،للعلامة أبو بكر أحمد بن الحُسين بن عليّ البيهقي مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية

شرح النووي على مسلم ،المؤلف: العلامة أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (المتوفى:٦٧٦هـ)الناشر: دار إحياء التراث العربي-بيروت

صحيح البخاري،للعلامة احمد بن إسماعيل أبوعبد الله البخاري الجعفيالمحقق: محمد زهير بن ناصر الناصر الناشر: دار طوق النجاة

صحيح مسلم ،للعلامة مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري، محمد فؤاد عبد الباقي دار إحياء التراث العربي-بيروت

عمدة القاري، للشيخ العلامة بدر الدين ابى محمد محمود بن احمد العينى دار احياء التراث العربى بيروت لبنان

فانی زندگی کے چند ایام، شیخ الحدیث مولانا حسن جان شہید رحمہ اللہ، القاسم اکیڈمی نوشہرہ

الفتاوى الهندية،المؤلف: لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخيالناشر: دار الفكرالطبعة: الثانية، ١٣١٠هـ-

فتاوى قاضيخان،للامام فخر الدين ابوالمحاسن الحسن بن منصور المعروف بقاضی خان الاوزجندی الفرغانی رحمۃ اللہ علیہ، قدیمی کتب خانہ

فتاوی محمودیہ،لفقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ، الناشر ادارہ الفاروق کراچہ

الفروق للقرافي،للعلامة أبو العباس شهاب الدين أحمد بن إدريس بن عبد الرحمن المالكي الشهير بالقرافي الناشر: عالم الكتب

فيض القدير،للعلامة زين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف المناوي القاهري الناشر: المكتبة التجارية الكبرى-مصرا

مجمع الأنهر للعلامة عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده,يعرف بداماد أفندي دار إحياء التراث العربي

مجمع الضمانات، أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي الناشر: دار الكتاب الإسلامي

المحيط البرهاني، للعلامة أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي

المدخل إلى السنن الكبرى، للعلامة احمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي المحقق: د. محمد ضياء الرحمن الأعظمي، الناشر: دار الخلفاء للكتاب الإسلامي - الكويت

مرقاة المفاتيح، للعلامة علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري الناشر: دار الفكر، بيروت - لبنان

مسند أحمد ط الرسالة، للعلامة أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون إشراف: د عبد الله بن عبد المحسن التركيالناشر: مؤسسة الرسالة

المفاتيح في شرح المصابيح، للعلامة الحسين بن محمود بن الحسن، مظهر الدين الزَّيْدَانيُّ الكوفي الضَّرِيرُ الشِّيرازيُّ الحَنَفيُّ المشهورُ بالمُظْهِري

مكارم الأخلاق للطبراني للعلامة سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني كتب هوامشه: أحمد شمس الدين، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنان الطبعة: الأولى، ١٤٠٩ه - ١٩٨٩م

الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنانالطبعة: الأولى، ١٤١٩ه - ١٩٩٩م

النصيحة الكافية لمن خصه الله بالعافية للعلامة شهاب الدين أبو العباس أحمد بن أحمد بن محمد بن عيسى البرنسي الفاسي، المعروف ب-زروق (المتوفى:۸۹۹ه.
هكذا علمتني الحياة، للعلامة مصطفى بن حسني السباعي (المكتب الإسلامي۔
صنوان القضاء وعنوان الافتاء، القاضی عماد الدین محمد بن محمد الخطیب الاشفور قانی، مکتبہ طیبہ کوئٹہ
علمی و فقہی مضامین، مفتی عبید الرحمن، دار التقوی، مردان